سلسلہ اشاعت نور ہدایت فاؤنڈیشن۔نمبر ۱۱

# صہیونی دہشت گردی

شکیل حسن شمسی



نام کتاب

صہیونی دہشت گردی

مصنف

شکیل حسن شمسی

shakeelhshamsi@gmail.com

سن اشاعت: 2008

ایڈیشن: First

ناشر

نور ہدایت فاؤنڈیشن

حسینیۂ غفران مآبؒ، مولانا کلب حسین روڈ، چوک، لکھنؤ۔ ۳ (انڈیا)

طابع

نظامی پریس، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ۔ ۳

قیمت

50 روپئے

# انتساب

حماس اور حزب اللہ

کے جیالے ناصران اسلام کے نام

جو اپنے لہو کی دھار سے

خنجروں کو کند کرنے میں

مصروف ہیں



## فہرست مضامین

# سخنان

بیسویں صدی کی تاریخ میں دنیا کے جغرافیائی نقشہ پر اسرائیل اور ابلاغی نقشہ پر آتنک وادیا دہشت گردی (اپنے موجودہ مفہوم میں) جادوئی اضافہ ہے۔ اسرائیل کو سماجی سیاسی تاریخ کا انتہائی غیر فطری (ناجائز) ''عجیب الخلقہ'' بچہ کہا جا سکتا ہے جسے دودھ کے بجائے فلسطینی خون پلا پلا کر اور دہشت کا کالا گوشت کھلا کھلا کر سامراج نے پالا پوسا۔ (مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کی ناپاک تقسیم نے سامراجی حوصلوں کو اتنی تقویت دے دی تھی کہ وہ اسرائیل ستوانسا اسقاط کو زندہ رکھ سکے۔) لیکن تاریخ گواہ ہے، عصر عاشور کی قسم، خون اور وہ بھی، مظلوم خون، وہ نہیں ہوتا جو آسانی سے ہضم نہیں ہو جائے۔ یہ بدہضمی یزیدی فکر کو بوکھلا کیا بولا نہ دے اور خون آشامی کے تخت کو اتنا ذلیل وخوار نہ کر دے کہ خود یزید کا نطفہ کا بھی اس کا خریدار نہ ہو سکے، تو اسے مظلوم خون نہ کہئے گا۔ کچھ ایسی ہی بدہضمی آج اسرائیل کو لاحق ہوگئی کہ اسرائیل جانے نہ جانے کس بے حالی اور مجبوری میں ہندوستان کے ایک مسلم وفد کی میزبانی پر اتر آیا۔ پھر یہی نہیں اس میں صحافتی شرکت بھی شامل کرالی۔

اس وفد کی میزبانی نے اسرائیل کا الوسیدھا کیا ہو یا نہ، شکیلؔ شمسی کی قلمی (پرنٹ) صحافت کی بہنی ضرور کرا دی۔ بنیادی طور پر دنیائے سمع وبصر (الیکٹرانک میڈیا) کا یہ نمایاں صحافی اسرائیل کی ہتھیائی دھرتی پر صحافی نظر، فلسطینی دل اور مسلم روح لے کر گیا۔ اپنے ہی بقول اس صحافتی ذمہ داری کو گلے لگائے گیا کہ ایک صحافی کو دشمن کی 'خبر رسانی' اور دوست کی خبر گیری کرنا پڑتی ہے۔ اس سے اسرائیل اور آتنک کو بہت قریب سے



دیکھا بھالا، ان کی زمینی حقیقتوں کا مشاہدہ کیا اور پھر ایک صحافی کے کھلے من سے تاریخ کی روشنی میں تجزیہ کیا، اپنے نتیجے نکالے اور قابل قدر رواں تبصرہ کیا۔ اس رواں تبصرہ کو سفر نامہ کے عنوان سے پیش کیا۔

نور ہدایت فاؤنڈیشن توسیع پذیر خدمات کے ضمن میں اسے اپنی گیارہویں فخریہ پیشکش کے طور پر آپ کی خدمت میں حاضر کر رہا ہے۔ آپ بھی شکیلؔ کے قلم کے ساتھ اسرائیل اور آتنک کو دیکھ لیجئے۔ دیکھئے گا فاضل مصنف کی شاعرانہ وراثت اور عمدہ زبان کا یہ قلمی انداز سفر نامہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں نامہ نگاری (رپورٹنگ) بھی ہے تفتیشی تبصرہ بھی اور تحقیقی تجزیہ بھی ہے۔ شاعرانہ کرب بھی ہے اور سماجی درد بھی۔

قوی امید ہے کہ قدرداں قارئین کرام اس کی بھی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔ جو قلم کار کی حوصلہ افزائی اور ہماری عزت افزائی کا باعث ہوگی۔

سید مصطفیٰ حسین ''اسیفؔ جائسی''
مدیر ماہنامہ ''شعاعِ عمل''، لکھنؤ

یوم القدس جمعۃ الوداع
۲۵ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ
۲۶ ستمبر ۲۰۰۸ء

# پیش لفظ

اسرائیل کے سفر پر جانے کا فیصلہ کسی جنگ کے محاذ پر جانے کے فیصلے سے کم نہیں تھا بلکہ جب ہم جنگ کے میدان میں اترتے ہیں تو اپنے ملک کے جانباز سپاہی کہلاتے ہیں، پوری قوم ہمیں فخر کی نگاہ سے دیکھتی ہے، موت اور زندگی دونوں ہی صورتوں میں اعزازات سے نوازا جاتا ہے لیکن بات جب اسرائیل کے سفر کی ہو اور وہ بھی کسی ایسے مسلمان کے لئے جسے واقعئی باعمل مسلمان بھی سمجھا جاتا ہو تو یہ ایک انتہائی مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ میں کتنا پکا اور سچا مسلمان ہوں اس بات کا تو کوئی دعویٰ ہی نہیں کر سکتا لیکن بہر حال میں مسلمان ہوں اس پر میرا یقین کامل ہے اور میں اس کا دعویٰ بھی کر سکتا ہوں۔

میں نے اسرائیل کے سفر پر جانے کا فیصلہ کیا اور تقریباً تمام تیاریاں مکمل بھی کر لیں مگر مجھے لگا کہ شائد میں اپنے اس سفر کے ذریعہ اپنی قوم کے ساتھ یا اپنے قلم کے ساتھ اتنا انصاف نہیں کر پاؤں گا جتنا کہ میرے ساتھی شکیل حسن شمسی۔ ذہن میں یہ خیال آنے کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ بے باک اور دلیر صحافی تھے اور ہیں دوسرے یہ کہ اس موضوع پر ان کا مشاہدہ کم از کم مجھ سے بہت زیادہ تھا اور ان کی واپسی کے بعد یہ بات ثابت بھی ہوگئی کہ ان کا یہ سفر کتنا کامیاب اور تاریخی سفر تھا۔ اب جبکہ وہ اپنے سفر نامہ کو ایک دستاویز کی شکل میں قلم بند کر رہے ہیں تو مجھے یقین کامل ہے کہ عالم اسلام اس سچائی سے نہ صرف واقف ہوگا بلکہ فلسطینیوں کے درد کو ان کی تحریر کی معرفت اس طرح محسوس کرے گا کہ گویا یہ مناظر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور اب حق و انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ فلسطین کی آزادی کے لئے اس پر جہاد واجب ہے۔





اسلامی جمہوریہ ایران کے ذریعہ ہر برس یوم قدس منایا جاتا ہے اور حضرت امام خمینی کا یہ قول ہے کہ اگر دنیا بھر کے مسلمان ایک ایک بالٹی پانی بھی اسرائیل پر ڈال دیں تو دنیا کے نقشے پر مکھی کی غلاظت جتنے اس ٹکڑے کا وجود بھی باقی نہیں رہے گا۔

قارئین کے سامنے کیوں کہ ایک مکمل دستاویز ہے لہٰذا میرا اس پر زیادہ لکھنا مناسب نہیں ہوگا۔ تاہم میں محترم شکیل حسن شمسی کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اپنی قوم کی خدمت میں یہ درخواست ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ اگر انھوں نے فلسطین کے مسئلے کو اپنا مسئلہ نہیں مانا تو آج بیشک یہ آگ ان کے گھروں سے دور سلگ رہی ہے مگر یہی چنگاری ان کے آشیانے کو جلا کر راکھ کر دے گی۔ موجودہ صورتحال میں جنھیں اس مسئلے پر شک کی گنجائش نظر آتی ہے وہ افغانستان اور عراق کی تباہی کا نظارہ یاد کریں۔ یاسر عرفات کی موت کے حقائق کو جانیں، بے نظیر بھٹو کے قتل کی حقیقت کو سمجھیں، عین ممکن ہے کہ میری بات ان کے دل میں اتر جائے اور شکیل حسن شمسی کی محض ایک کتاب ہی تاریخ کا وہ ناقابل فراموش باب بن جائے جس کے ذریعہ آنے والی نسلیں بھی آج کی آنکھوں دیکھی حقیقت کو سمجھ سکیں۔ خدا حافظ

عزیز برنی

گروپ ایڈیٹر سہارا اردو میڈیا

بسمہ سبحانہ

# تمہید

شکر ہے اس اللہ کا جس نے مجھے سچ بولنے کی طاقت سے نوازا اور اس نے مجھے اس نیک کام کی توفیق عطا کی کہ میں ارض فلسطین کا دورہ کروں اور ان غاصبوں کا چہرہ بے نقاب کروں جو گزشتہ ساٹھ برسوں سے مظلوم انسانوں کا خون نہایت بے دردی سے بہا رہے ہیں لیکن اس سفر پر جانے سے قبل مجھے کافی ذہنی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف مخالفین کی جانب سے سب وشتم کا سلسلہ تھا تو دوسری طرف عزیز، رشتے دار، دوست احباب اور چاہنے والے لوگ بھی ناراض اور فکرمند تھے۔ سب یہی چاہتے تھے کہ میں اسرائیل کے دورے پر نہ جاؤں۔ اسی کے ساتھ کچھ اخباروں کے ذریعہ روزنامہ راشٹریہ سہارا کی مخاصمت کے سبب جو تحریک چلائی جا رہی تھی اس میں بھی دل آزار مضامین شائع ہو رہے تھے حالانکہ ہندوستان سے اسرائیل جانے والے وفد میں ملک کے تین بڑے اداروں کے نمائندوں کو شامل کیا گیا تھا یعنی پی ٹی آئی، یو این آئی اور راشٹریہ سہارا۔ ظاہر ہے یہ تینوں ادارے ہی ہندوستانی صحافت کے تین ایسے ستون ہیں جن کے بغیر اردو صحافت کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے لیکن دلچسپ بات تو یہ تھی کہ صرف روزنامہ راشٹریہ سہارا کے خلاف ہی زہر اگلا جا رہا تھا۔ ان نامساعد حالات کی وجہ سے مجھے انتہائی کربناک لمحات کا سامنا کرنا پڑا۔ حالانکہ کسی ظالم مملکت کا یہ میرا پہلا دورہ نہیں تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے ستمگر اور جارح ملک امریکا کا میں نے دو بار دورہ کیا لیکن کسی نے کچھ نہیں کہا، مخالفت میں ایک لفظ کہیں نہیں چھپا، پھر اسرائیل میں رپورٹنگ کے لئے





جانے پر آخر کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا جو اتنا ہنگامہ مچایا جا رہا تھا؟ وفد میں جو لوگ شامل تھے ان کے خلاف آواز اٹھانے کی وجہ تو سمجھ میں آسکتی تھی لیکن کسی صحافتی ادارے کے خلاف یہ زہر افشانی بڑی معنی خیز تھی۔ دیانتداری کا اتنا تقاضہ تو تھا ہی کہ میری واپسی کا انتظار کیا جاتا اور میرے مضامین یا میری بھیجی ہوئی خبریں چھپنے کے بعد ہی تنقید کا سلسلہ شروع کیا جاتا۔ خیر جو کچھ ہوا سو ہوا۔ میں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھ کو اس مشکل سفر پر جانے کی توفیق عطا کی اور اس کے ساتھ ساتھ اس رب کریم نے مجھے سچ بولنے کا حوصلہ اور ایک ایسا قلم عطا کیا جس کو کوئی خرید نہیں سکتا تھا۔

جب میں واپس آیا اور میں نے لکھنا شروع کیا تو سفر نامہ کی پہلی قسط کو روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر نے صفحہ اول پر بینر ہیڈ لائین یعنی آٹھ کالم کی شاہ سرخی کے ساتھ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اللہ کا شکر کہ پہلے ہی دن سے اس سفر نامہ نے قارئین پر یہ بات واضح کر دی کہ اخبار میں کیا چھپنے والا ہے۔ ہر دن لوگوں کی دلچسپی اس میں بڑھتی ہی گئی۔ یہ امتیاز راشٹریہ سہارا کو ہی حاصل ہوا کہ فلسطین کی تاریخ میں پہلی بار کوئی ہندوستانی صحافی وہاں گیا اور وہاں کے ایسے حالات بیان کئے جو کسی بھی ذریعہ سے ان تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ میرے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو ان اخباروں کو سانپ سونگھ گیا جو اپنے کالم سیاہ کرتے چلے آرہے تھے۔

ہر دن ان گنت فون، خطوط، فیکس اور ای میل اس سلسلے میں آتے رہے اور قارئین مجھے اپنی دعاؤں سے نوازتے رہے۔ میں مسلمانوں کی جس بستی میں جاتا لوگ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ کئی لوگوں نے ساری قسطیں بہت سنبھال کر رکھیں تھیں وہ اخبار کی کٹنگ مجھے خوشی خوشی دکھاتے اور میرا حوصلہ بڑھاتے۔ کئی لوگوں نے کہا کہ راشٹریہ سہارا کے

خلاف اردو کے جن اخباروں نے زہرافشانی کی تھی ان کی آپ کے مضامین نے بولتی بند کردی۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا کی ویب سائٹ پر بھی ان مضامین کو ہزاروں لوگوں نے پڑھا اور مجھے دعائیں دیں۔یہی نہیں بنگلور کی ایک مسلم تنظیم نے میرے اعزاز میں ایک شاندارعشائیہ کا انتظام کیا جس میں سابق مرکزی وزیر جناب جعفرشریف، کرناٹک کے سابق وزیر جناب روشن بیگ اور کئی دوسرے معزز افراد نے میرے دورہ فلسطین کے سلسلے میں بات چیت کی اور مجھے اپنی محبتوں سے نوازا۔

کچھ ماہ قبل ایک پروگرام میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر جناب شاہد مہدی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے میرے سفرنامہ کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جانا چاہیئے لیکن ان سب باتوں سے زیادہ خوشی مجھے اس وقت ہوئی جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ اسرائیل کے کچھ ذمہ داروں نے میرے مضامین کے خلاف میرے مدیر اعلیٰ سے بہت طویل شکایتیں کیں لیکن چونکہ میرے سفرنامہ کا ایک ایک لفظ سچا تھا اس لئے انھوں نے ان ساری شکایتوں کو خارج کردیا۔اب میرا سفرنامہ ایک کتاب کی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں نے اس کتاب میں دو اضافی مضامین بھی شامل کردئے ہیں ( مضامین بھی سہارا میں میرے کالم آزادقلم کے تحت چھپ چکے ہیں) تاکہ یہودیت ،صہیونیت اور فلسطین کی مختصرسی تاریخ سے وہ لوگ واقف ہوسکیں جو تاریخ کے طالب علم نہیں ہیں۔امید ہے یہ کتاب قارئین کو پسند آئے گی اور وہ مجھے اپنی دعاؤں سے ضرور نوازیں گے۔

آخر میں ایک بات کہنا ضروری ہے کہ میرے سفرنامہ کو مدیر محترم جناب عزیز برنی





صاحب نے جس طرح شائع کیا وہ شائد ہی کوئی دوسرا ایڈیٹر کرتا۔ ہر روز فل پیج انھوں نے میرے نام کیا اور میرے لکھے ہوئے مضامین میں ایک لفظ کی تراش خراش نہیں کی۔ ہر روز کاپی دیکھنے کے بعد وہ ذاتی طور پر یا ٹیلی فون کے ذریعہ ستائشی کلمات سے ضرور نوازتے اور یہی کہتے جب تک آپ لکھنا چاہیں لکھیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ایک ایسے صحافی کی ادارت میں کام کیا جو اپنے سینے میں انسان اور اسلام کا درد رکھتا ہے۔ جو آج کے یزیدوں کے خلاف بھی اسی انداز میں بولتا اور لکھتا ہے جس طرح وہ چودہ سو سال پہلے کے ستم گر کے خلاف زبان کھولتا ہے۔ یہاں ایک بات کہتا چلوں کی عزیز برنی صاحب نے میرا تقرر جلد شروع ہونے والے اردو کے چینل عالمی سہارا میں سینئر پروڈیوسر (پروگرامنگ ہیڈ) کے بطور کیا تھا لیکن انھوں نے مجھے پرنٹ کی صحافت میں بھی اپنے ہاتھ آزمانے کا پورا موقع دیا جو کسی دوسرے میڈیا ہاؤس میں ممکن نہیں تھا۔اس کے علاوہ انھوں نے مجھے اخبار میں حرف آخر کے عنوان سے روزانہ ایک قطعہ لکھنے کے لئے بھی کہا جس کے ذریعہ میں اپنے خیالات کا اظہار آسانی سے کرنے لگا۔ حرف آخر کے تحت چھپ چکے (اسرائیل کے متعلق ) کچھ قطعات اس کتاب کے آخر میں شامل کردئے گئے ہیں۔

آخر میں صرف اتنا کہنا ہے کہ اس کتاب کا سارا کریڈیٹ برنی صاحب کو جاتا ہے اللہ ان کو صحت وسلامتی عطا کرے۔ والسلام

**شکیل حسن شمسی**

سینئر پروڈیوسر

عالمی سہارا اردو چینل

# یہودیت کا تعارف

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہودی مسلمانوں کی طرح حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ اور
حضرت ابراہیمؑ پر یقین رکھتے ہیں۔لیکن وہ اصل میں ایک اوالعزم پیغمبر حضرت موسیٰؑ کی
امت ہیں۔فرعون کے طاقت ور لشکر کو فنا کر دینے والے مظلوم نواز اور مظلوم پرست
حضرت موسیٰؑ کا ساتھ دینے والی یہ امت بنی اسرائیل کہلائی لیکن یہودیوں کو حضرت
یعقوبؑ کے ایک فرزند یہودہ سے وابستگی ہونے کے باعث یہودی مذہب کی شکل میں
پہچان ملی۔ یہودہ کو انگریزی میں Juda کہا جاتا ہے اس لئے یہودیت کو
Judaism کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہودہ حضرت یوسفؑ کے ان بھائیوں میں
شامل تھے جنھوں نے حضرت یوسفؑ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن عین موقع پر
یہودہ نے حضرت یوسفؑ کو قتل کرنے سے اپنے بھائیوں کو باز رکھا اور ان کو یہ مشورہ دیا کہ
یوسفؑ کو کنویں میں پھینک دیا جائے۔ کچھ روایتوں کے مطابق جب حضرت یوسفؑ کو مصر
کی حکومت ملی تو حضرت یوسف سے ملنے کے لئے ان کے والد حضرت یعقوبؑ آئے تو
حضرت یوسفؑ کے دل میں ایک بار یہ خیال پیدا ہوگیا کہ وہ ایک بادشاہ ہیں اور کیا ان
کے لئے یہ مناسب رہے گا کہ وہ اپنے باپ کے خیر مقدم کے لئے جائیں؟ (حالانکہ
حضرت یوسفؑ بعد میں اپنے والد کے استقبال کے لئے خود تشریف لے گئے) لیکن اللہ
تعالیٰ کو حضرت یوسفؑ کے دل میں پیدا ہونے والا خیال پسند نہیں آیا کیوں کہ اللہ نے
باپ کو بہت بلند مرتبہ عطا کیا ہے۔بس اتنی سی بات پر اللہ نے یوسف کی نسل سے پیغمبری
یہودہ کی نسل میں منتقل کردی۔ یہودہ کا وہ عمل اللہ کو پسند آیا تھا جو انھوں نے حضرت یوسف





کو قتل سے بچانے کے لئے اختیار کیا تھا۔لیکن تاریخ میں ایک یہودہ نام کا ایک اور شخص
بھی ہے جس کو بائبل میں حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ دغا بازی کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔
عیسائیوں کے عقائد کے مطابق اسی آدمی نے چاندی کے صرف چالیس سکوں کی خاطر
حضرت عیسیٰ کی نشاندہی ان افراد کے سامنے کردی تھی جو ان کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے
لیکن مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق جس آدمی کی نشان دہی کی گئی تھی وہ عیسیٰؑ نہیں تھے
بلکہ ان کا ایک حواری تھا۔اس طرح یہودہ نے ان یہودیوں کو دھوکہ دیا جو حضرت عیسیٰؑ کو
مصلوب کرنا چاہتے تھے۔عیسائی فرقہ کے لوگ یہودیوں کی دغاباز ذہنیت کے لئے اسی
یہودہ کا پیرو بتاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ یہودی ایک آسمانی مذہب کے پیروکار ہیں لیکن جیسا کہ ہوتا آیا تھا کہ
پیغمبر کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کی امت بھٹک گئی۔ یہودیوں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی
ہوا۔انھوں نے خود کو سب سے افضل اور اللہ کی پسندیدہ قوم سمجھ لیا۔مظلومیت کی بنیاد پر
حضرت موسیٰؑ کے ساتھ آنے والی قوم خود ہی ظالم بن گئی یہاں تک کہ اسی قوم نے یروشلم
کے بازاروں میں حضرت عیسیٰؑ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے اور (اپنی دانست میں) ان کو
شہر کی ایک اونچی پہاڑی پر لے جا کر مصلوب بھی کر دیا (مسلمان مانتے ہیں کہ حضرت
عیسیٰ کو نہیں ان کے ایک ہمشکل کو مصلوب کیا گیا تھا) عیسیٰؑ کی خطا کیا تھی؟ یہی نہ کہ انھوں
نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا تھا؟ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے مریضوں
کے امراض کو دور کر دیتے تھے؟ اسی خطا کی بنیاد پر یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ اور ان کی
امت پر شدید مظالم ڈھائے۔اس لئے جب عیسائی اقتدار میں آئے تو یہودیوں
کو حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھانے کے جرم کی پاداش میں عیسائیوں کی طرف سے بے

انتہا مظالم کا سامنا کرنا پڑا۔ (ان مظالم کے بارے میں آگے کے صفحات پر گفتگو کی گئی ہے ) چھ سو سال تک یہودیوں پر عیسائیوں کے مظالم جاری رہے اور لاکھوں یہودی مارے گئے لیکن جب حضرت عیسیٰؑ کے بعد خاتم المرسلینؐ نے اس دنیا میں قدم رکھا تو یہودیوں کے ربائیوں کو توریت میں بیان کی ہوئی بہت سے نشانیوں کے ذریعہ یہ معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ حضرت محمدؐ ہی وہ آخری نبی ہیں جن کے انتظار میں یہ دنیا قائم ہے۔ شروع شروع میں تو عیسائی اور یہودی دونوں ہی اپنی کتابوں میں بیان کی گئی علامتوں کے تحت خاتم الانبیاء کا انتظار کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ تاریخ میں یہ واقعہ بھی ملتا ہے کہ کمسنی کے دور میں آنحضرت اپنے شفیق چچا حضرت ابو طالبؑ کے ہمراہ جب شام کی طرف جا رہے تھے تو راستے میں ایک عیسائی راہب نے انھیں روک کر کہا تھا کہ آپ اس بچے کو لے کر شام نہ جائیں کیوں کہ اس بچے میں وہ خصوصیات موجود ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں آخری پیغمبر کے سلسلے میں موجود ہے۔ راہب نے اس بات کی نشان دہی بھی کی کہ آنحضرت کا سایہ زمین پر نہیں پڑ رہا ہے۔ راہب کی بات پر یقین کرتے ہوئے حضرت ابو طالبؑ کمسن محمد کو شام لے جانے کے بجائے مکہ کی طرف واپس چلے گئے۔ اس واقعہ کے تقریباً تیس سال بعد جب آنحضرت نے اعلان بعثت کیا اللہ کے حکم کو عام کرنا شروع کیا تو وہ یہودی ربائی اور عیسائی راہب جو کل تک ایک پیغمبر کے انتظار میں تھے ان کو پیغمبر تسلیم کرنے سے انکار کرنے لگے حالانکہ ان کی کتابوں میں اس سلسلے میں واضح طور پر بشارت موجود تھی۔

جزیرہ نمائے عرب آج جس کو سعودی عرب کہا جاتا ہے کسی وقت وہ تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک کو نجران دوسرے کو نجد اور تیسرے علاقہ کو حجاز کہا جاتا تھا نجران میں





عیسائی، حجاز میں یہودی اور نجد میں کفار قریش آباد تھے۔

## مسلمان اور یہودی

ہر مسلمان کا عقیدہ ہے پیغمبر حضرت محمدؐ جو دین اپنے ساتھ لائے تھے وہ ان ہی ادیان کی آخری کڑی ہے جن کو اللہ نے حضرت آدم، حضرت نوحؑ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ذریعہ زمین پر اتارا تھا لیکن وقت کے ساتھ ان پیغمبروں کی ملتوں نے اصل دین میں تبدیلیاں کر لیں۔ ہمارے پیغمبر نے جب (اللہ کے حکم کے مطابق) اسلام کو پھیلانا شروع کیا تو عیسائی فرقہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مان چکے تھے اور شرک میں مبتلا تھے۔ کفار قریش مکہ کو صنم پرستی کا اڈہ بنا چکے تھے۔ صرف ایک یہودی قوم ایسی تھی جس کے عقائد میں تبدیلی ہو جانے کے باوجود اس کے کچھ عقائد مسلمانوں کے جیسے ہی تھے۔ یہ لوگ اللہ کی وحدانیت کے قائل تھے۔ ان کا مرکز یعنی مسجد اقصیٰ اور مسلمانوں کا قبلہء اول ایک تھا۔ جانور کو ذبح کرنے کا طریقہ بھی ایک جیسا تھا۔ یہودیوں کی طرح مسلمانوں میں بھی روزہ رکھنے کا حکم تھا (اوقات اور ایام میں البتہ فرق تھا) حشر کے دن سب کو پھر سے زندہ کیا جائے گا یہ عقیدہ بھی دونوں قوموں میں مشترک تھا۔ ختنہ کی رسم بھی دونوں فرقوں میں ایک جیسی تھی۔ دونوں فرقہ چاند کی تاریخوں والے کیلنڈر پر ہی یقین رکھتے تھے۔ ہلال کو مذہب کے تشخص کی علامت کے طور پر مسلمانوں کی طرح یہودیوں بھی استعمال کرتے تھے (بعد میں یہودیوں نے اس کو اسٹار آف ڈیوڈ میں تبدیل کر لیا) لیکن دونوں فرقوں کے بیچ سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ یہودی حضرت عیسیٰؑ کو پیغمبر خدا اور ہمارے آنحضرتؐ کو اللہ کا آخری نبی نہیں مانتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اہم فرق یہ تھا

کہ یہودی خود کو اللہ کی پسندیدہ اور سب سے اشرف قوم گردانتے تھے جب کہ اسلام کے مطابق دین اسلام سب سے بہترین مذہب اور اللہ کے سب بندے آپس میں برابر ہیں۔ یہودیوں نے اپنے علماء کو خدا جیسا مان لیا تھا جب کہ اسلام کی نظر میں علماء کی پرستش شرک تھی۔ یہودیوں کی کتاب توریت میں شراب کی مدح خوانی تھی تو مسلمانوں کی کتاب یعنی قران پاک میں شراب کو حرام قرار دیا گیا تھا۔ یہودیوں میں سودخوری عین ایمان تھی اور مسلمانوں کے لئے سود کھانا ایک بدترین گناہ تھا۔ اس وقت بھی یہودی فرقہ کے لوگ ( آج کل کی طرح ) مال دار تھے اس لئے مزدوروں، غلاموں اور غریب لوگوں پر مظالم کرنا ان کا پسندیدہ کام تھا۔ جب کہ اسلام مزدوروں، غلاموں اور غریبوں کے ساتھ بہترین سلوک کا داعی تھا۔ عام لوگوں کے بنیادی حقوق غصب کرنا یہودیوں کا شیوہ تھا جب کہ اسلام ہر انسان کے بنیادی حقوق کا محافظ اور ضامن تھا۔

## ہجرت اور یہودیت

جب رسولؐ کے چچا حضرت ابو طالبؑ کی وفات ہوئی تو بنی ہاشم کے نئے سردار ابولہب نے رسولؐ کو تحفظ دینے کے بجائے ان کے قتل کا منصوبہ بنالیا مگر اللہ کے کرم سے اسلام کی رمق نجد سے پہلے ہی حجاز میں پھیل چکی تھی۔ حجاز کے سب سے اہم شہر یثرب کے لوگوں نے رسولؐ کریم کو اپنے شہر آنے کی دعوت دی کیوں کہ وہاں کے دو قبیلے بنی اوس اور بنی خزرج کے درمیان مسلسل خونریزی ہوتی تھی یثرب کے لوگوں نے رحمت الالعالمینؐ کو اس لئے دعوت دی کہ وہاں خونریزی بند ہو۔ جب ہمارے رسولؐ مکہ سے ہجرت کر کے یثرب پہنچے تو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ وہاں آباد بہت سے یہودیوں نے بھی اپنی چھتوں پر کھڑے ہو کر پیغمبر صاحب کا استقبال کیا۔ پیغمبر صاحب نے اسلام کے





اصولوں کے عین مطابق یثرب میں امن قائم رکھنے کی غرض سے ایک امن معاہدہ کا مسودہ سب کے سامنے پیش کیا جس کو یثرب کے تمام قبیلوں اور مذاہب نے بخوشی قبول کیا۔ اس معاہدہ کے تحت یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہودی اپنے مذہب پر عمل درآمد کرنے کے لئے آزاد رہیں گے۔

اس معاہدے کے بعد یثرب میں امن وامان کا دور بحال ہوا اور اس کا نام بدل کر مدینۃ الرسول ہو گیا وہاں آباد یہودی آنحضورؐ، ان کے اہلبیتؑ اور ساتھیوںؓ کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر اسلام قبول کرنے لگے۔ تب یہودیوں کے علماء اور قبیلہ کے سرداروں کو لگا کہ ہمارا تو مذہب ہی ختم ہو جائے گا لھذا انھوں نے اپنی مکروہ طینت کے مطابق اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ شروع شروع میں رسولؐ پر کفار قریش کی جانب سے جو حملے ہوئے اس میں یہودی غیر جانب دار رہے لیکن جیسے جیسے کفار قریش شکست سے ہمکنار ہونے لگے اور اسلام کی طاقت بڑھنے لگی تو یہودی سردار اور علماء کفار قریش کے ساتھ سازشوں میں شریک ہونے لگے۔ یہودیوں کی یہ سازشیں اس امن معاہدے کی کھلم کھلا خلاف ورزی تھیں جو رسولؐ نے ہجرت کے پہلے سال میں ان کے ساتھ کیا تھا۔ جنگ احزاب ( جنگ خندق ) میں یہودیوں نے کفار کا ساتھ دیا۔ معاہدے کی خلاف ورزی کی سزا تو ان کو ملنا ہی تھی اس لئے مسلمانوں کی فوج نے حضرت علی کی علم داری میں یہودیوں کے سب سے مضبوط قلعہ یعنی خیبر پر اپنا علم نصب کر دیا۔ خیبر کی جنگ میں یہودیوں کو شکست فاش ہوئی لیکن خیبر کی شاندار فتح کے باوجود پیغمبر اسلام نے یہودیوں کو اسلامی مملکت سے نکال باہر نہیں کیا۔ جو امن پسند یہودی تھے وہ مسلمانوں کے حفظ وامان میں زندگی گزارتے رہے لیکن اس کے بعد یہودی کبھی لشکر کشی

کی ہمت نہیں کر سکے۔(خیبر کی جنگ میں مات کھانے کا زخم یہودیوں کے سینے میں ابھی
بھی تازہ ہے اور ان کہ مختلف ویب سائٹ پر خیبر کی ہزیمت ناک شکست کو اپنی مظلومی
کے بطور پیش کیا جا رہا ہے جب کہ حقیقت تو یہ تھی کہ یہودی اس وقت مسلمانوں کے
مقابلے میں تعداد میں بھی زیادہ تھے اور ان کے پاس اسلحوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی مگر
فاتح خیبر حضرت علی مرتضیٰؓ کے زور بازو کے آگے یہودیوں کی ایک نہ چل سکی۔

## یہودیوں اور عیسائیوں کی جنگیں

حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھائے جانے کے صرف 70 سال بعد رومن بادشاہوں
نے یہودیوں کی طاقت کو تہس نہس کر دیا اور ان کو در در بھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ زمین جس کو
توریت میں اللہ کی بخشی ہوئی مملکت سے تعبیر کیا گیا تھا اور جس کو عبرانی زبان میں
Eretz Yisra'el یعنی ارض اسرائیل کے نام سے پکارا گیا تھا وہاں سے یہودی
بھاگ کر حجاز، یمن اور ایران میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

جب اسلام کی روشنی پھیلی تو یہودی فرقہ کے لوگ حجاز کے علاوہ ایران میں بھی بڑی
تعداد میں آباد تھے۔ رومیوں کے ظلم و تشدد سے بچنے کے لئے وہ لوگ ایران کے زرتشتی
بادشاہ سائرس کی پناہ میں چلے گئے تھے اور اس وقت سے وہیں آباد تھے۔ جب دوسری
خلافت کے دور میں ایران پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا تو تو اس وقت یہودیوں کی
پسندیدہ ارض مقدسہ یعنی یروشلم پر پارسیوں ں کا تسلط تھا۔ قبلہء اول پر مسلمانوں کا قبضہ
ہوا تو یہودیوں کو مسلمانوں نے پریشان نہیں کیا بلکہ ان کو عیسائیوں کے شر سے محفوظ
رکھا۔ چار سو سال تک یروشلم میں آباد یہودی مسلمانوں کے زیر سایہ اپنے مذہبی امور کی
ادائیگی آرام سے کرتے رہے لیکن 1099 میں عیسائیوں کو پھر سے طاقت مل گئی اور





انھوں نے یروشلم پر قبضہ کر لیا اور مسجد اقصیٰ پر صلیب نصب کر دی یہاں کے ہزاروں
مسلمان اور یہودی باشندے عیسائیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

اللہ کی مدد سے 1187 میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے ایک بار پھر ارض فلسطین
کو مسیحی فوج کے چنگل سے آزاد کروا کر پرچم اسلام لہرایا لیکن صرف چار دہائیوں کے بعد
صلاح الدین ایوبی کے جانشین الکامل سے روم کے بادشاہ فریڈرک نے 1228 میں
ایک بار پھر یہ علاقہ چھین لیا لیکن سولہ سال کے بعد 1244 میں ایران کے خوارزم شاہی
بادشاہ نے نے یروشلم کو آزاد کروایا اور یہ علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اس کے بعد
یہاں مملوک اور ترک حکومتوں نے راج کیا۔

پہلی جنگ عظیم میں فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب فلسطین سے
مسلمانوں کو بے دخل کرنے کی سازش تیار کی گئی۔ عیار دماغ رکھنے والے یہودیوں نے
ہٹلر کے ساتھ چل رہی اتحادیوں کی جنگ کا خوب فائدہ اٹھایا اور خود کو ہٹلر کے عتاب کا
سب سے بڑا شکار بتا کر اور ہولوکاسٹ کے واقعہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے برطانیہ اور
امریکہ سے انعام کی شکل میں اپنے لئے ایک ملک مانگ لیا۔ جس طرح انگریزوں نے
ہندوستان کو چھوڑتے وقت اس کے دو ٹکڑے کئے اسی طرح انھوں نے فلسطین کے بھی دو
ٹکڑے کر دئے اور مسلمانوں کے سینے میں صہیونی مملکت کی شکل میں ایک ناسور پیدا کر
دیا۔ 1948 میں ارض فلسطین تقسیم ہوگئی اور دنیا کی پہلی صہیونی سلطنت صفحۂ ہستی پر وجود
میں آئی۔

# صہیونی اور صہیونیت

فلسطین میں واقع مقدس شہر یروشلم کی فصیلوں کے باہر ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جس کو جبل صہیون یا Mount Zion کہا جاتا ہے۔ اپنے یروشلم میں قیام کے دوران میں نے کئی لوگوں سے جبل صہیون کے بارے میں دریافت کیا تو ایک ضعیف فلسطینی نے مجھ کو بتایا کہ انیسویں صدی کی شروعات میں اسی پہاڑ کے سائے میں کچھ یہودی ربائیوں اور مذہبی افراد نے اس مملکت کے قیام کا منصوبہ بنایا تھا جس کی بشارت ان کی کتاب توریت میں دی گئی ہے اور اسی سازشی ٹولے کے ناپاک منصوبے نے 14 مئی 1948 کو ایک مملکت کی شکل اختیار کی جس کو آج کی دنیا صہیونی ریاست کے نام سے جانتی ہے۔ بائبل کے حوالوں کے مطابق کسی زمانے میں اسی پہاڑ پر یہودیوں کا سب سے مقدس مندر جبل ھیکل Temple Mount واقع تھا۔ اس کو سکندر اعظم کے مرنے کے کچھ برس بعد رومیوں کے ایک لشکر نے برباد کر دیا۔ اس ھیکل کی بربادی کے بعد یہودیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جہاں پر مسجد اقصیٰ واقع ہے وہیں پر ان کا اصلی ھیکل تھا جس کو حضرت سلیمان پیغمبر نے تعمیر کیا تھا۔ حالانکہ یہاں پر جو عبادت گاہ تھی وہ حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کردہ مسجد تھی۔ یہاں پر کوئی ھیکل کبھی تھا ہی نہیں مگر صہیونی اب اسی بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ جہاں مسجد اقصیٰ ہے وہیں جبل ہیکل واقع تھا۔

جبل صہیون پر پیغمبر حضرت داؤد کا مزار ہے جہاں یہودی، عیسائی اور مسلمان عقیدت واحترام کے ساتھ جاتے ہیں (اسی مزار کے بالائی حصہ میں ایک محراب بھی قائم ہے جہاں مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے) عیسائیوں کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھنے





والا وہ مقام بھی Room of the Last Supper. جبل صہیون پر ہی واقع ہے جہاں حضرت عیسیٰ نے آخری بار کھانا کھایا تھا۔ اسی پہاڑ پر عیسائیوں کا ایک مشہور قبرستان بھی ہے۔ ہٹلر کی جانب سے مبینہ طور پر ہلاک کئے گئے یہودیوں کی یاد میں ہولوکاسٹ میوزیم بھی یہودیوں نے اسی پہاڑ پر قائم کیا ہے جس کو یادوشم کہا جاتا ہے۔ جبل صہیون پر ایک سڑک ایسی بھی ہے جس کو پوپ کا راستہ کہا جاتا ہے اس سڑک سے پوپ پال ششم 1964 میں گزرے تھے اسی لئے اس کو ان کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے جبل صہیون کی یہی سڑک ایک زمانے میں اردن اور اسرائیل کے بیچ no-man's land تصور کی جاتی تھی۔ ان باتوں کے علاوہ صہیونیت کا اس پہاڑ کا کوئی دوسرا رشتہ نظر نہیں آتا پھر بھی یہودی بڑے فخر سے خود کو صہیونی کہتے ہیں آخر کیوں؟ اس افتخار کی ایک وجہ یہی لگتی ہے کہ اسی پہاڑ کی کسی اونچائی پر بیٹھ کر انسانیت کو نیچے ڈھکیلنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا اور دنیا کے طول وارض میں آباد یہودیوں کو یروشلم اور اس کے آس پاس بسانے کا خفیہ منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ جبل صہیون پر رچی گئی سازش سے قبل تک یعنی سن 1800ء میں فلسطین میں صرف 6,700 یہودی تھے لیکن اس سازش کے بعد 1880 میں یہودیوں کی تعداد اچانک 24,000 ہوگئی۔ جب فلسطین کی طرف یہودیوں کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو صہیونی مملکت کی سازش کو عملی روپ دینے کے لئے Austro-Hungarian نسل کے ایک یہودی Theodor Herzl نے 1890 میں صہیونی مملکت کا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہرزل کے منصوبے کو سب ہی یہودیوں نے پسند کیا اور انھوں نے تیزی کے ساتھ فلسطین کی طرف سفر شروع کر دیا۔ 1915 میں دنیا کے مختلف ملکوں سے ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہونے

والے یہودیوں کی تعداد 87500 ہوگئی۔ 1931 میں مغربی ممالک میں عیسائیوں کی طرف سے چل رہی یہودی مخالف مہم کے بہانے ہزاروں یہودی فلسطین میں زندگی گزارنے کے لئے پہنچنے لگے، اس سال ان کی آبادی 174,000 ہوگئی۔ 1947 آتے آتے فلسطین میں 630,000 یہودی آباد ہو چکے تھے دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس طرح کی منصوبہ بند ہجرت کو حکومت برطانیہ کی حمایت حاصل تھی۔ یہودیوں کی اس طرح منصوبے بند داخلہ کے خلاف کئی بار مسلمانوں نے صدائے احتجاج بھی بلند کی جس کے نتیجہ میں مسلمان کاشتکاروں اور یہودیوں کے درمیان 1920 اور 1921 میں نسلی فسادات پھوٹ پڑے۔ 1929 میں ایک بار پھر مقامی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان فساد ہوا تو برطانیہ کے حکومت نے اس غیر قانونی ہجرت پر پابندی لگانے کے بجائے جھوٹ موٹ کی بندش لگا دی اور یہاں آنے والے تارکین وطن پر جرمانہ عائد کرنا شروع کر دیا۔ یہودیوں کو پیسے کی کون سی کمی تھی جو وہ اس سے متاثر ہوتے اس لئے یہ سلسلہ رکا نہیں پھر بھی یہودی انتہا پسند حکومت برطانیہ پر الزام لگانے لگے کہ وہ اپنے عرب دوستوں کو خوش کرنے کے لئے یہودیوں کے فلسطین میں بسنے پر پابندی لگا رہی ہے۔ اسی جھوٹ موٹ کے الزام کو لے کر یہودی دہشت گردی پر اتر آئے اور ان کی دہشت گردانہ تنظیمیں بن گئیں۔ اصل میں صہیونی قوم ہی دہشت گردی کی موجد ہے۔ اس نے اپنی لڑائی کو جنگ کے میدان سے نکال کر شہری آبادی تک پہنچا دیا۔ یہی صہیونی تھے جنھوں نے دنیا میں پہلی بار دہشت گردانہ حملہ کی ابتدا کی۔ اس سے پہلے کہ صہیونیت کے بارے میں مزید گفتگو ہو، دہشت گردی سے صہیونیت کے رشتوں پر ایک نظر ڈال لی جائے تو بہتر رہے گا۔





## دہشت گردی کے موجد صہیونی

صہیونی آج بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ انھوں نے سی ٹی اسکین کی مشین ایجاد کی، دنیا کو سلولر فون دیا، براک میزائیل دی، اندھیرے میں دیکھنے کے لئے نائٹ ویژن ڈیوائیس کی ایجاد کی اور یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے لال ٹماٹر بھی ایجاد کرنے کا طعنہ یہودی دیا کرتے ہیں لیکن وہ یہ کبھی نہیں بتاتے کہ دہشت گردی کے بھی وہی موجد و مفکر ہیں۔ ازل سے انسان نے جنگ کے سلسلے میں یہ ایک رویہ اختیار کر رکھا تھا کہ اپنے مفاد کے لئے دوسرے انسانوں کے ساتھ کسی حد تک بھی جا سکتا تھا لیکن جب انسان تہذیب کے دائرے میں داخل ہوا تو اس نے اپنے لئے بہت سے قوانین وضع کئے۔ مختلف ادیان نے بھی جنگ کے اصول وضوابط طئے کئے۔ اسلام کے آنے کے بعد تو جنگ کے معاملے میں اتنے بہتر قانون بنے کہ جن کا کوئی ثانی ہی نہیں تھا۔ ایک زمانے میں جنگ کے لئے بڑے بڑے میدان چنے جاتے تھے، حملہ آور فوجیں کسی ملک پر قبضہ کرتے وقت وہاں کے فوجی ٹھکانوں پر ہی حملہ کرتی تھیں۔ البتہ کبھی کبھی شہری ٹھکانوں پر بھی حملہ ہو جاتا تھا لیکن جب انسان بیسویں صدی میں داخل ہوا تو اس نے ایسے ہتھیار ایجاد کئے جو صرف فوجی ٹھکانوں پر نہیں شہری علاقوں کو بھی تباہ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ امریکہ کے وحشی سیاستدانوں نے ایٹم بم کا جیسا ہتھیار ایجاد کر لیا جس نے ایک ہی آن میں لاکھوں لوگوں کو موت کی نیند سلا دیا لیکن اس سے بھی زیادہ مہلک ہتھیار یہودیوں نے ایجاد کیا اور اس ہتھیار کا نام ہے دہشت گردی۔۔۔ انھوں نے بے گناہ شہریوں کو چھپ چھپ کر قتل کرنا شروع کیا۔ صہیونی دہشت گردوں سے پہلے دنیا میں کسی کو اپنی بات

منوانے کے لئے بے گناہوں کونشانہ بنانے کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔اس سے پہلے Terrorist Groups کی اصطلاح سے دنیا واقف بھی نہیں تھی لیکن اب یہ خار دار شجر پوری دنیا میں پھیل گیا ہے۔

بیسویں صدی پر اگر ہم نگاہ ڈالیں تو دیکھیں گے کہ اس صدی نے دنیا کو دہشت گردی کی تین قسمیں عطا کی ہیں۔ پہلی ہے انفرادی دہشت گردی (جس کے موجد صہیونی ہیں) دوسرے قسم کی دہشت گردی کو سرکاری دہشت گردی کہا جاتا ہے اس کی ایجاد ہٹلر نے کی تھی اور اس نے لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے Terror Machines بنوائی تھیں۔ تیسرے قسم کی دہشت گردی کو Mob Terrorism کہا جاتا ہے۔ دہشت گردی کے اس طریقے کے تحت ایک بڑا ہجوم اقلیتی فرقہ پر حملہ کر کے اس کو دہشت زدہ کرتا ہے (اس کی ایجاد کا سہرا سنگھ پریوار کے سر باندھا جانا چاہئے لیکن بدقسمتی سے اس قسم کی دہشت گردی کو ہمارے ملک میں دہشت گردی نہیں بلکہ فرقہ وارانہ فساد کا نام دیا گیا) دہشت گردی کے کئی رنگ بھی ہیں کچھ پر مذہبی رنگ چڑھا ہوتا ہے تو کچھ پر نسلی لیبل لگا ہوتا ہے۔ کچھ دہشت گرد علاقائی خودمختاری اور آزادی کے نام پر دہشت برپا کرتے ہیں تو کچھ کو دہشت گرد کسی خاص نظریہ کو پھیلانے کے لئے بندوق ہاتھ میں اٹھاتے ہیں۔ کچھ گروہ ثقافت اور تہذیب کی دہائی دیتے ہیں تو کچھ دہشت پسند اپنے قلم اور زبان سے لوگوں کے دلوں کو زخمی کرتے ہیں۔ لیکن یہاں پر صرف اس دہشت گردی کی بات کی جارہی ہے جس کو انفرادی دہشت گردی کہا جاتا ہے اور اس دہشت گردی پر مذہب کا لیبل لگا ہوا تھا۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ یہودیوں کو ان کی کتاب توریت میں ایک ایسی مملکت





دئے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا جہاں (یہودیوں کے عقیدے کے مطابق) اللہ کی سب سے پسندیدہ قوم کی حکومت ہونا تھی۔ جب بیسویں صدی کے اوائل میں جرمنی اور اتحادی فوجوں کے درمیان پہلی جنگ عظیم چھڑی تو ترکی کی خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں کو فلسطین سمیت کئی علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ برطانیہ کی فوجیں جب فلسطین پر قابض ہو گئیں تو برطانیہ نے فلسطین کے دو ٹکڑے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اس نے یہودی فرقہ کے لوگوں کو چپکے چپکے فلسطین میں داخل ہونے کی چھوٹ دے دی تھی۔ ان ہی یہودیوں کے سرپھرے گروہوں نے ایک صہیونی مملکت کے قیام کے لئے دہشت گردی کو ہتھیار بنایا۔ صہیونیوں کے مسلح گروہ فلسطین کے عرب باشندوں کو بے دریغ مارنے لگے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ 1930 سے 1948 کے درمیان فلسطین میں چار ایسے گروہ سرگرم تھے جن کو حکومت برطانیہ نے دہشت پسند گروہ قرار دیا تھا۔ یہ چاروں دہشت پسند گروہ بہت زیادہ بے رحم اور سفاک تھے۔

Irgun Zvai Leumi نام کا ایک دہشت پسند گروہ جو فلسطین میں سرگرم تھا مسلمانوں پر مظالم کے لئے بہت مشہور تھا۔ اس کا سربراہ اسحاق شمیر نام کا ایک یہودی تھا جس کو اسرائیل بن جانے کے بعد وزیر اعظم کا عہدہ ملا۔ کچھ برسوں بعد اسحاق شمیر کے Irgun Zvai Leumi گروہ سے اختلافات ہو گئے Lehi نام کے دوسرے دہشت پسند گروہ میں شامل ہو گیا جس کا سرغنہ .Avraham Stern نام کا صہیونی تھا جو برطانوی پولیس کے ہاتھوں ایک مڈبھیڑ میں مارا گیا تھا۔ اس کی موت کے بعد شمیر دہشت پسند گروہ کا سرغنہ بن گیا اور 1944 میں اس کے گروہ نے برطانیہ کے مشرق وسطیٰ کے معاملات کے وزیر Lord Moyne کا قتل کیا اور برطانیہ کے

فلسطین میں ہائی کمشنر Harold MacMichael پر قاتلانہ حملہ بھی کیا تھا۔شمیر کے گروہ کا سب سے بدترین ظلم دیار یٰسین کا قتل عام تھا جس میں کئی سو بے گناہ مسلمانوں کو صہیونی دہشت گردوں نے گھروں میں گھس کر قتل کر دیا تھا۔اس زمانے میں اسحاق شمیر کے زندہ یا مردہ گرفتار کروانے کی اطلاع دینے والوں کے لئے دس ہزار برطانوی پاؤنڈ کا انعام مقرر تھا۔

صہیونیوں کا ایک اور بہت ہی خطرناک دہشت پسند گروہ کا نام Haganah تھا اس دہشت پسند گروہ نے تل ابیب کے جعفہ نام کے علاقہ اور حیفا میں مسلمانوں کا کئی بار قتل عام کیا۔اسی گروہ نے یروشلم کے مشہور ہوٹل کنگ ڈیوڈ پر بھی بم سے حملہ کر کے کچھ برطانوی فوجیوں سمیت 91 شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔اس گروہ کا سرغنہ کوئی اور نہیں بلکہ اسرائیل کا ایک وزیر اعظم میناخم بیگن تھا۔اس زمانے میں میناخم بیگن کے سر پر ایک لاکھ برطانوی پونڈ کا انعام مقرر تھا۔قارئین کو یاد ہوگا کہ بعد میں میناخم بیگن کو امن کا نوبل انعام بھی دیا گیا تھا۔

مشرق وسطیٰ میں اقوام متحدہ کے نمائندے Count Folke Bernadotte کو بھی صہیونی دہشت گردوں نے اس جرم میں قتل کر دیا تھا کہ اس نے صرف ایک دن پہلے اقوام متحدہ سے کہا تھا کہ وہ فلسطین کے تارکین وطن کی واپسی کے حق کو یقینی بنائے۔

صہیونی دہشت پسندوں کا چوتھا گروہ Stern Gang کے نام سے سرگرم تھا اور یہ گروہ عرب بستیوں میں رہنے والے مسلمانوں کو دہشت زدہ کر کے ان کو وہاں سے بھگانے کا کام انجام دے رہا تھا اس گروہ کے پیچھے بھی ایک بہت ہی نامور صہیونی لیڈر بن غریان تھا یہ دہشت گرد شخص، اسرائیل کے قیام کے بعد وہاں کا پہلا وزیر اعظم بنا۔





Stern Gang کے دہشت پسند گروہ مسلمان کاشت کاروں اور زمینداروں کو دہشت میں مبتلا کر کے ان کو یہودیوں کے ہاتھوں سستے داموں پر زمین فرخت کرنے پر مجبور کر رہا تھا لیکن دنیا کے دوسرے حصہ میں آباد مسلمانوں کو صہیونی ذرائع ابلاغ یہ خبر دیتے رہے کہ فلسطین کے کسان اور زمیندار اپنی خوشی سے اپنی زرعی اور رہائشی زمینیں اسرائیلیوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں جبکہ بندوق بردار دہشت پسندوں کے گروہ قریہ قریہ میں دہشت کا ننگا ناچ کر رہے تھے۔ یہودی دہشت گردی کی مکمل روداد لکھنا تو یہاں ممکن نہیں لیکن اس دہشت گردی کی ایک چھوٹی سی تصویر ذیل کی سطور میں پیش کر رہا ہوں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو جائے کہ فلسطین کے مسلمان کس طرح کے مصائب سے دو چار ہوئے ہیں۔

اگست 1937 میں صیہونیوں نے عربوں کی بسوں کو نشانہ بنانا شروع کیا اور بے گناہ مسافروں کو قتل کر کے فلسطین میں دہشت کا ماحول پیدا کیا ان لوگوں نے دو سال میں درجنوں بس مسافروں کا قتل کیا۔نومبر 1940 میں انھوں نے ایک بحری جہاز S.S.Patria کو نشانا بنایا لیکن غلطی سے بم پہلے ہی پھٹ گیا اور اس میں سوار ڈھائی سو سے زیادہ یہودی مارے گئے جو یوروپ کے مختلف ممالک سے بسنے کے لئے فلسطین میں حیفہ کی بندرگاہ پر اتر رہے تھے۔نومبر 1946 میں روم میں واقع برطانوی سفارت خانے کو ایک بم کے ذریعہ یہودی دہشت پسندوں نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا اور اس کی ذمہ داری Irgun نے قبول کی۔ 1947 میں یہودی دہشت پسندوں نے لیٹر بم بھیجنے کا سلسلہ شروع کیا اور لندن کے ایک ڈاکخانے میں تین ستمبر 1947 کو برطانوی وزارت دفاع کے نام بھیجے گئے ایک لفافہ میں بلاسٹ ہوا جس سے دو لوگ زخمی

ہوئے۔ اس کی ذمہ داری بھی Irgun پر عائد کی گئی۔ گیارہ دسمبر 1947 کو عرب مسافروں سے بھری ایک بس پر صہیونی دہشت پسندوں نے حملہ کر کے چھ مسلمانوں کو ہلاک اور بیس کو زخمی کر دیا۔ اسی دن ایک اور حملے میں حیفہ کے ایک دیہات میں صہیونی دہشت پسندوں نے بارہ عرب مسلمانوں کو قتل اور کئی کو زخمی کر دیا۔ ان مسلمانوں کی خطا یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی زمینیں یہودیوں کے ہاتھ بیچنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے دو دن بعد یہودی دہشت پسندوں نے یروشلم کی ایک مارکیٹ میں بم پھینک کر اٹھارہ فلسطینی مسلمانوں کو شہید اور تقریباً ساٹھ کو زخمی کر دیا۔ یہ بازار مسجد اقصیٰ کے دمشق دروازہ کے قریب واقع ہے۔ اسی دن ایک اور حملہ میں جعفہ میں عباسیہ گاؤں کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے باری افراد کو صہیونی دہشت گردوں نے مشین گن سے بھون دیا۔

انیس دسمبر 1947 کو سفاد کے نزدیک واقع ایک عرب گاؤں پر حملہ کر کے دو مکانوں کو زمیں بوس کر دیا گیا۔ ان مکانوں کے ملبہ سے پانچ بچوں سمیت دس افراد کی لاشیں نکالی گئیں۔ اس حملہ کی ذمہ داری Haganah دہشت پسند گروہ نے اپنے سر لی۔

اس واقعہ کے دس دن بعد Irgun کے ایک دہشت پسند گروہ نے دمشق دروازے کے پاس ایک بم پھینکا۔ جس سے دو برطانوی سپاہی اور گیارہ عرب راہگیر ہلاک اور بتیس شدید طور پر زخمی ہو گئے۔ اس حملہ کے اگلے ہیں دن بلاد الشیخ قصبہ میں ساٹھ فلسطینی مسلمانوں کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ ان کی خطا یہی تھی کہ وہ صہیونیوں کے خوابوں کی جنت کے لئے زمین خالی کرنے سے انکار کر رہے تھے۔

1947 سے 1948 کے درمیان 385 گاؤں، قصبہ اور شہروں میں رہنے والے سات لاکھ فلسطینیوں کے مکان بلڈوزروں سے گرا کر ان کو فلسطین سے بھاگنے پر مجبور کیا





گیا اور دنیا میں پروپگینڈہ یہی کیا گیا کہ فلسطینیوں نے اپنی زمین یہودیوں کے ہاتھ خود ہی بیچ دی۔

پہلی جنوری 1948 کو ماؤنٹ کارمل میں سترہ مسلمانوں کو تہہ تیغ اور تینتیس کو زخمی کر کے یہودیوں نے دنیا کو نئے سال کی مبارک باد دی۔ اس کے تین دن بعد عرب نیشنل کمیٹی کے جعفہ میں واقع دفتر پر حملہ کر کے Haganah کے دہشت گردوں نے چالیس مسلمانوں کو قتل اور 98 کو زخمی کر دیا۔ اگلے دن ایک مسلمان کے ہوٹل پر حملہ کر کے بیس افراد کو تہہ تیغ کیا گیا۔ یہاں مرنے والوں میں اسپین کا قونصل Viscount de Tapia بھی شامل تھا۔ سات جنوری کو مسجد اقصیٰ کے قریب ہوئے ایک اور حملہ میں سترہ عرب مارے گئے اور اس حملہ سے گھبرا کر اپنی جان بچانے کی فکر میں تین لوگ دیواروں سے گر کر ہلاک ہو گئے۔ سولہ جنوری کو تین مکانوں پر حملہ کر کے صہیونی گروہ نے آٹھ بچوں کو ہلاک کر دیا۔

13 دسمبر 1947 سے 10 فروری 1948 کے درمیان یہودی دہشت گردوں کے بسوں، ریسٹورنٹ، ہوٹل اور بازاروں میں کئے گئے حملوں میں 138 افراد ہلاک اور 271 لوگ زخمی ہوئے۔ چار ٹرینوں کو بارودی سرنگوں سے اڑا کر 93 مسافروں کو مارا گیا اور 161 کو زخمی کر دیا گیا۔ فروری سے تیرہ مئی تک ہر طرف لوٹ کا بازار گرم رہا اور کئی سو مسلمانوں کی جان گئی اس کی تفصیل لکھنے کے لئے ایک کتاب الگ سے لکھنا پڑے گی۔ چاروں دہشت پسند گروہ ہر طرف قتل و دہشت کا ماحول گرم کرتے رہے۔ مکانوں کو گرا کر نئی بستیاں آباد کرتے رہے۔ اس طرح فلسطین کو اسرائیل کے غاصبانہ نام میں بدل دیا گیا۔ (دہشت گردوں کو مجاہد آزادی کا لقب مل گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں

کہ دنیا کے نقشہ پر صرف اسرائیل ایک ایسا منحوس ملک ہے جس کے تین وزرائے اعظم پہلے دہشت پسند تھے اور بعد میں ان کو ملک کی سب سے بڑی کرسی پر بٹھا دیا گیا) صہیونیوں کی دہشت گردانہ کارروائیوں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ تشدد سے گھبرا کر حکومت برطانیہ نے معاملہ کو نئی نئی وجود میں آئی اقوام متحدہ کو سونپ دیا۔ امریکہ اور برطانیہ کی کٹھ پتلی اقوام متحدہ نے 29 نومبر 1947 کو فلسطین کو مذہبی بنیاد پر تقسیم کرنے کی قرارداد 13 کے مقابلے 33 ووٹوں سے پاس کردی۔ 10 ممالک ایسے تھے جنھوں نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ UNGAResolution 181 نام کی اس قرار داد کے مطابق فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے ساتھ ساتھ یروشلم کو اقوام متحدہ کی زیر نگرانی رکھا جانا طئے ہوا تھا۔ عرب ملکوں نے اس قرارداد کو مسترد کر دیا مگر یہودیوں نے تل ابیب کی سڑکوں پر جشن منانا شروع کر دیا۔ اس قرارداد کے بعد یہودی ریاست نے اسلحے جمع کرنا شروع کر دئے اور اپنی مملکت کا اعلان اس وقت تک نہیں کیا جب تک وہ اپنے دفاع کے قابل نہیں ہوگئی۔ 14 مئی 1948 کو بن گورین کی قیادت میں اس سر زمین پر اس عفریت نے آنکھیں کھولیں جس نے جبل صہیون پر ولادت پائی تھی۔ اسی دن چار عرب ممالک کی مشترکہ افواج نے اسرائیل پر حملہ کر دیا لیکن آٹھ مہینے تک لڑائی کرنے کے باوجود عربوں کو اسرائیل پر فتح نہ مل سکی۔ 1949 میں Armistice Agreement کے بعد یہ جنگ رکی تو ایک نئی فائر بندی لائین وجود میں آئی جس کو گرین لائین کا نام دیا گیا۔ صہیونیوں نے اپنی جیت کے نشہ میں یروشلم کے متعلق یو این کی تجویز کو ٹھکرا دیا اور زور زبردستی سے اس علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا جس کو اقوام متحدہ کی قرار داد کے مطابق بین الاقوامی شہر کی حدود میں ہونا چاہیئے تھا۔





1967 میں عرب ممالک نے ایک بار پھر اسرائیل کے خلاف مورچہ کھولا اور امریکہ کی حمایت کے سبب اسرائیل کو زبردست فتح ملی (اصل میں 67 کی لڑائی اسرائیل نے لڑی ہی نہیں تھی اس کی پوری حکمت عملی امریکا نے تیار کی تھی) اس جنگ میں عربوں کو مزید علاقہ سے ہاتھ دھونا پڑا اور یروشلم پر اسرائیل کا غاصبانہ قبضہ ہوگیا۔ قبلہء اول پر قبضہ کرنے کے باوجود دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ نے صہیونیوں اور مسلمانوں کی جنگ کو ہمیشہ عرب اسرائیل قضیہ سے تعبیر کیا تاکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس قضیہ سے الگ رکھا جا سکے۔

1979 میں ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد جب مرحوم خمینی نے اس کو مسلمانوں اور صہیونیت کی جنگ سے تعبیر کیا تو معاملے نے نیا رنگ پکڑ لیا۔ لبنان میں بھی اسلامی لہر آئی اور فلسطینی جدوجہد نے بھی فلسطین کا پرچم چھوڑ کر اسلامی پرچم اٹھا لیا۔ اس تبدیلی کے بعد اس اسرائیل کو تشویش ہوئی جو علاقہ کا پولیس والا بن گیا تھا اور ہر طرح کے ظلم و زیادتی کی اس کو اجازت حاصل ہوگئی تھی۔ اسی زعم میں اس نے دو بار لبنان پر حملہ کیا لیکن وہاں اس کو حزب اللہ کے ہاتھوں شکست کا مزہ چکھنا پڑا۔ مسلمانوں کے بڑھتے دباؤ کے بعد اس کو فلسطین کے کئی علاقوں سے دستبردار ہونا پڑا اور اب کئی یہودی لیڈر کھلے عام یہ بات بھی کہنے لگے ہیں کہ اسرائیل کو اپنا دامن سمیٹ کر 1967 کی سرحدوں میں واپس چلا جانا چاہیئے لیکن اسرائیل کی حکومت اور کٹر یہودی لابی کو 67 والی سرحد میں واپس جانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کیوں کہ ان کا صہیونی مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب کہ وہ مسجد اقصیٰ کو ھیکل سلیمان میں تبدیل نہ کر دیں۔ اپنی اسی سازش کو عملی شکل دینے کے لئے صہیونی لابی نے اب یہ پروپگینڈہ شروع کر دیا ہے کہ مسجد اقصیٰ سے

مسلمانوں کا کوئی تاریخی تعلق نہیں کیوں کہ شب معراج کے جس واقعہ کا ذکر قران میں ہے (معاذ اللہ) وہ صرف حضرت محمدؐ کا ایک خواب تھا۔ اگر آپ انٹرنیٹ پر صہیونی لابی کی طرف سے کئے جا رہے پروپگینڈہ پر نظر ڈالیں تو آپ کو جگہ جگہ یہی بات ملے گی کہ شب معراج نہ تو وہاں رسولؐ کریم کبھی تشریف لائے نہ کوئی براق اترا کیوں کہ (نعوذ باللہ) یہ تو مسلمانوں کے پیغمبر نے محض ایک خواب دیکھا تھا۔ جبکہ مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ شب معراج کے سفر کے دوران اللہ تعالیٰ کے ذریعہ بھیجے گئے براق کے ذریعہ ہمارے رسولؐ بہ نفس نفیس مسجد اقصیٰ تک تشریف لے گئے اور وہاں نماز ادا کی۔ اتنا ہی نہیں مسجد کی جس مغربی فصیل کو یہودی دیوار گریہ کہتے ہیں وہ مسلمانوں کی نظر میں فصیل براق ہے۔ شب معراج کے سلسلے میں کئے جا رہے اس پروپگینڈہ کا مطلب بالکل صاف ہے یعنی مسجد اقصیٰ سے مسلمانوں کو دستبردار ہونے کو کہا جائے۔ اتنا ہی نہیں اسرائیل کے باشندوں کی اکثریت مشرق وسطیٰ کے کئی مسلمان ممالک کو تباہ کر کے گریٹر اسرائیل کے قیام کا خواب دیکھ رہے ہیں

## گریٹر اسرائیل کا خواب

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہودی بھی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبری یقین رکھتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے آٹھ بیٹے تھے جن میں سب سے بڑے بیٹے کا نام حضرت اسماعیل تھا اور ان سے چھوٹے بیٹے کا نام حضرت اسحاق تھا۔ حضرت اسحاقؑ کے دو بیٹے تھے جن میں سے ایک حضرت یعقوبؑ تھے جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے تھے جن میں حضرت یوسف کو پیغمبری ملی اور یوسف کے بعد ان کے بھائی یہودہ کی نسل میں یہ پیغمبری منتقل ہوگئی۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ یہودیوں کو





یہودہ کی نسل کی پیروی کرنے کے باعث یہودی کہا گیا۔ یہودیوں کے عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب یعنی حضرت اسرائیل کو ایک وسیع وعریض مملکت عطا کی تھی جس کو Complete Land of Israel کہا گیا تھا۔ اس مملکت کا جو رقبہ بیان کیا جاتا ہے اس کے مطابق اس کی ایک سرحد دریائے نیل کے کنارے پر ہے دوسری سرحد فرات سے ملتی ہے۔ اس مملکت کی سرحدوں پر اگر آج ہم غور کریں تو اس میں فلسطین، مصر، لبنان، اردن، شام، عراق، ترکی اور یہاں تک کہ سعودی عرب کے وہ تمام شہر شامل ہیں جن میں ہمارے مقامات مقدسہ بھی ہیں۔ یہودیوں کے لئے گریٹر اسرائیل کا مطلب ہے مشرق وسطیٰ کے اہم ترین مسلمان ممالک کی تباہی اور بربادی۔

اسرائیل والوں کا کہنا ہے کہ ایک ہزار سال قبل مسیح اس مملکت خدا داد کا خواب پیغمبر حضرت داؤد کی حکومت کے زمانے میں پورا ہوا تھا جب انھوں نے لشکر کشی کے ذریعہ بنی اسرائیل کے خوابوں کی سلطنت کو .King David's Empire کی شکل میں دنیا میں قائم کر دیا تھا۔ توریت میں اس Eretz Yisrael Hashlema کہہ کر اس ملک کی بشارت دی گئی تھی جس میں مطلب ہوتا ہے اسرائیل کا کل علاقہ۔ کئی کٹر یہودی رہنما اور کئی انتہا پسند گروہ کھلے عام اس بات کی وکالت کرتے ہیں کہ مختلف مسلم ممالک کو برباد کر کے گریٹر اسرائیل کا قیام کیا جانا چاہیئے۔ لیکن اسرائیل کے سیاستداں اور سرکار سے تعلق رکھنے والے افراد آج (دنیا کو فریب دینے کے لئے) اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ ان کے منشور میں ایک گریٹر اسرائیل کا قیام شامل ہے۔ شائد گریٹر اسرائیل کا نظریہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے ابھی مناسب موقع نہیں آیا ہے۔ حالانکہ جب امریکہ نے عراق پر قبضہ کیا تو انتہا پسند صہیونیوں کا گروہ بہت خوش تھا

کہ گریٹر اسرائیل کا خواب پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اسرائیل کے حکام یا سیاست داں گریٹر اسرائیل کے قیام کے بارے میں اپنی تمناؤں کو لاکھ چھپانے کی کوشش کریں لیکن ان کے دلی خواہش کا غماز خود ان کا قومی پرچم ہے جس میں سفید رنگ کے ایک کپڑے پر نیلے رنگ کے دو دریا دکھائے گئے ہیں اور ان دریاؤں کے درمیان میں اسٹار آف ڈیوڈ ہے جو اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ فرات سے لے کر دریائے نیل تک ایک ایسے ملک کا قیام ہونا ہے جو حضرت داؤد کی سلطنت کے برابر ہوگا۔ ظاہر ہے گریٹر اسرائیل کا قیام کئی مسلمان ممالک کو تباہ کر کے ہی ہوسکتا ہے۔ جب صہیونی رہنما کئی مسلمان ممالک کی تباہی کی بات کررہے ہوں تو ایران کے صدر احمدی نژاد اگر صرف اسرائیل کے خاتمہ کی بات کریں تو کون سا جرم کررہے ہیں؟

## صہیونیوں کی کتابیں

صہیونیوں کی مذہبی کتاب کا نام توریت ہے جس کو وہ لوگ Torah کہتے ہیں جس کا عبرانی زبان میں مطلب ہوتا ہے ہدایت نامہ۔ یہ کتاب مسلمانوں کی نظر میں آسمانی کتاب تھی لیکن بعد میں یہ منسوخ ہوگئی۔ اس کتاب کے بارے میں یہودی مذہب بہت زیادہ حساس ہے اور اس کے عقائد کے مطابق اس کتاب کو اگر کوئی جلا دے تو یہ دنیا کا سب سے بڑا اور نا قابل معافی جرم ہے لیکن اس سلسلے میں ایک عجیب وغریب اور دلچسپ عقیدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کو توریت پڑھنے کے لئے دے تو یہ توریت کو جلانے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔

علاوہ یہودیوں کی ایک بدنام زمانہ کتاب ہے جس کا نام Talmud ہے۔ عبرانی زبان میں تحریر اس کتاب میں یہودی فرقہ کے ربائیوں کی جانب سے بنائے گئے





قوانین اور نفرت آمیز تقاریر جمع کی گئی ہیں۔ اس میں حضرت عیسیٰؑ کی شان میں گستاخیاں ہیں اور یہاں تک حضرت مریمؑ کی طہارت اور عصمت پر سوالیہ نشان لگائے گئے ہیں۔ اس کتاب میں عورتوں کے ساتھ انتہائی ناروا سلوک کیا گیا ہے اور مردوں کو یہ حق دیا گیا ہے کہ جب ان کی بیوی کا کنوارا پن ثابت نہ ہو تو وہ ان کے ساتھ جانوروں کی طرح پیش آئیں۔ اس کتاب میں یہودیوں کی برتری اور دوسرے تمام فرقوں کی کمتری کو بیان کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ کتاب نہ آسمان سے اتاری گئی نہ ہی اس کو کسی پیغمبر سے منسوب کیا گیا ہے اس لئے اس میں انسانیت دشمن مواد کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا ہے؟ اسی کتاب کی روشنی میں ہی یہودی آج فلسطین کے عوام پر بے تحاشہ ظلم کررہے ہیں اور پورے علاقہ کے عوام پر انھوں نے عرصۂ حیات تنگ کررکھا ہے۔

# غاصبوں کے علاقہ کا سفر

جب میں نے صحافت کی دنیا میں قدم رکھا تو میرے کچھ ارمان تھے کچھ تمنا ئیں تھیں۔ پہلا ارمان تو یہ تھا کہ کبھی اقوام متحدہ کے دفتر کے باہر کھڑے ہوکر رپورٹنگ کرنے کا موقع ملے۔ایک تمنا یہ تھی کہ ہندوستان پاکستان کی سرحد پر کھڑے ہوکر خبر نگاری کا کام انجام دوں۔میرے دل میں یہ بھی ارمان تھا کہ کبھی فلسطین کا دورہ کروں اور یروشلم ،غازہ اور رملہ سے کوئی رپورٹ بھیجوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری یہ تمام خواہشیں پوری ہوئیں۔کچھ پہلے ممکن ہوئیں اور کچھ سہارا سے وابستگی کے سبب پایہء تکمیل تک پہنچیں۔ اب دو تمنا ئیں دل میں باقی ہیں پہلی تو یہ کہ کبھی عراق کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملے اور بغداد، نجف یا کربلا کی ڈیٹ لائین سے امریکی فوجوں کے انخلاء کی رپورٹ اپنے قارئین تک پہنچاؤں۔دوسری خواہش یہ ہے کبھی حزب اللہ کے لیڈر سید حسن نصر اللہ سے انٹرویو کرنے کا موقع ملے تو میری صحافتی زندگی کا اہم ترین خواب مکمل ہو جائے۔

اگست کے دوسرے ہفتہ میں اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی لیکن یروشلم یعنی القدس کا سفر کوئی آسان کام نہ تھا کیوں کہ آج اس سرزمین تک مسلمانوں کی رسائی دشوار ہوگئی ہے۔قدس کی مقدس سرزمین پر صیہونیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد سے اس پاک سرزمین سے مسلمانوں کا رشتہ ٹوٹ سا گیا ہے چونکہ یہاں آنے جانے کے لئے ویزہ اسرائیل کی حکومت جاری کرتی ہے اس لئے کسی مسلمان کے لئے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ اسرائیل کی حکومت سے ویزا حاصل





کر کے یروشلم جائے۔ہمارے قبلہء اول کے دروازے ہمارے لئے ہی بند ہو چکے ہیں۔

عجیب تاریخی سچ ہے کہ جب مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے یہودیوں کے قلعہ خیبر کے در کو اکھاڑا اور لشکر اسلام نے یہودیوں پر فتح پائی اس وقت یہودیوں کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی ہم اقلیت میں تھے مگر یہودیوں کو شکست فاش ہوئی۔آج مسلمان دنیا کی دوسری سب سے بڑی اکثریت ہیں اور یہودی ایک بہت چھوٹی سی اقلیت ہیں لیکن مسلمانوں کے بکھراؤ ،فرقہ بندی، آپسی رنجش ،نفسا نفسی ،آمروں کی امریکہ پرستی اور عوام کے اسلامی تعلیمات سے دور ہونے کے سبب گزشتہ 60 برسوں سے ایک چھوٹی سی اقلیت ہم پر ہر طرح کے ظلم و ستم توڑ رہی ہے اور ہم خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ یہودی اپنے زعم میں اس قدر آگے بڑھتے گئے کہ انھوں نے مشرق وسطیٰ میں جو ستم مناسب سمجھا وہ کیا اور تمام مسلمان اس کو خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ ایک زمانے تک تو اس قضیہ کو عرب اسرائیل تنازعہ کا نام دیا جاتا رہا اور صرف عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ برسر پیکار رہے ان کے ساتھ کچھ فلسطینی گروہ بھی اپنے ملک کی آزادی کے لئے کوشاں رہے۔ 1967 میں مصر کے سربراہ جمال عبدالناصر کی قیادت میں عربوں نے آخری بار اسرائیل سے لوہا لینے کی کوشش کی لیکن شکست فاش کے بعد اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔فلسطین کے مسلمان یہودیوں کے غلام بن گئے۔اس کے بعد سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے مسجد اقصیٰ کے دروازے بند ہو گئے صرف یروشلم کے مقامی باشندوں کو اس بات کی اجازت حاصل رہی کہ وہ پانچ وقت نماز پڑھ سکیں۔اپنی اس فتح پر یہودیوں نے خوب جشن منائے اور

اسی جشن کے جوش میں 1969 ایک یہودی انتہا پسند نے مسجد اقصیٰ کا وہ تاریخی منبر جلا دیا جو کسی زمانے میں مسلم فرمانروا صلاح الدین ایوبی نے بنوایا تھا۔اسرائیل کے خلاف چل رہی مہم سمٹ کر فلسطینی مزاحمت میں تبدیل ہوگئی۔ فلسطینی مسلمان مرتے رہے اور دنیا بھر کے مسلمان اس معاملے کو عرب اسرائیل قضیہ کے شکل میں دیکھتے رہے لیکن ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد امام خمینی نے پہلی بار اسلامی دنیا کو یہ باور کروایا کہ اسرائیل کے قیام کا معاملہ عربوں کا نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا مسئلہ ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے قبلہء اول پر صیہونیوں کے ناجائز قبضہ کے خلاف دنیا بھر کے مسلمانوں کو آواز دی اور اس طرح قبلہء اول کی آزادی کی جدوجہد کو تیز کرنے پر آمادہ کیا۔مسلمانوں کی نئی نسل قبلہء اول کو بھول نہ جائے اس غرض سے انھوں نے جمعۃ الوداع کو یوم قدس کے نام سے منسوب کر کے مسلمانوں میں ایک نئی لہر پیدا کی۔خدا کا شکر ہے کہ کبھی مشرق وسطیٰ میں عرب اسرائیل کے نام سے مشہور ہونے والا تنازعہ آج اسلام اور صیہونیت کے بیچ چل رہے ایک معرکہ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔اسرائیل کی غاصب حکومت جانتی ہے کہ جب تک معاملہ صرف عرب اسرائیل تنازعہ کی شکل میں رہے گا اس کی لڑائی آسان رہے گی۔اس لئے اس کی آج پوری کوشش یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کی آگ سے تمام دنیا کے مسلمان الگ تھلگ رہیں اس کے باوجود گزشتہ بیس پچیس برسوں میں اسرائیل کے خلاف مسلمانوں میں زبردست بے چینی پیدا ہوئی ہے جس کے سبب اسرائیل بھی امن کی بات چیت کرنے پر مجبور ہوا ہے لیکن اب تک اسرائیل کی حکومت کی ایک ہی کوشش رہی ہے امن بھی ہو جائے اور فلسطینیوں کو ان کے حقوق بھی دینا نہ پڑیں۔اسرائیل کی اسی پالیسی کے سبب مشرق وسطیٰ میں اب تک امن قائم نہ ہو سکا، فلسطینی مزاحمت روز بروز تیز





ہی ہوتی گئی۔لبنان پر قبضہ جمانے کی کوشش نے اسرائیل کو حزب اللہ کے روپ میں ایک اور طاقت ور اور ناقابل تسخیر پڑوسی دیا۔اس کے علاوہ فلسطینی تحریک نے بھی قومیت کا نقاب اتار کر اسلامی پرچم اختیار کیا۔حماس کی شکل میں مسلمانوں کی ایک زبردست تحریک فلسطین میں ابھری۔لگاتار بڑھ رہے اسلامی رجحان سے پریشان ہو کر اور حزب اللہ سے شکست کھانے کے بعد اسرائیل کے عوام کا ایک طبقہ اور وہاں کی کچھ فلاحی انجمنیں مشرق وسطیٰ میں ایک بڑی جنگ کے بادل منڈراتے دیکھ رہی ہیں اور ان کو لگ رہا ہے کہ اگر ساری دنیا کے مسلمان ایک ہو گئے تو اسرائیل کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔اس لئے ان کی طرف سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کو قریب لایا جائے اور کسی طرح سے معاملے کو حل کیا جائے۔اسی خیال کے پیش نظر امریکہ میں بسنے والے یہودیوں کے ایک ادارے پروجیکٹ انٹرچینج اور آسٹریلیا میں بسنے والے یہودیوں کی تنظیم آسٹریلیا اسرائیل جیوش افیئر کونسل نے مشترکہ طور پر ایک پہل کی اور ہندوستان سے کچھ مسلمانوں کو مدعو کیا تاکہ وہ امن کے راستے تلاش کریں۔اس وفد کے ساتھ جانے کے لئے راشٹریہ سہارا کی طرف سے راقم الحروف کو مامور کیا گیا۔

ایک روز مجھ سے جناب عزیز برنی صاحب ایڈیٹر اردو سہارا نے کہا کہ ہندوستان سے ایک امن وفد اسرائیل جا رہا ہے اور اس میں آپ کو سہارا کے نمائندے کی حیثیت سے جانا ہے۔ایک ایسے ملک میں مجھے جانا تھا جس کو بچپن سے میں نے ایک ظالم، جابر اور غاصب ملک کی شکل میں دیکھا اور سوچا تھا۔میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔جاؤں کہ نہ جاؤں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کیوں کہ میں یروشلم یا غزہ اور حیفہ جانے کا خواہشمند تو تھا لیکن اسرائیل جانے کے بہت سے منفی پہلو بھی تھے۔اس تذبذب کی آگ پر میرے دوستوں

کی رائے نے اور زیادہ پٹرول ڈالا۔ میرے ایک عزیز نے مجھے ایران سے ای میل کر کے یہ بار بار کہا کہ میں اسرائیل کسی قیمت پر نہ جاؤں۔ اسرائیل سے کسی قسم کا رشتہ رکھنا خود میری نظر میں بھی ایک گناہ کبیرہ تھا۔ ایک طرف صحافتی ذمہ داری تھی تو دوسری طرف سماجی اور اخلاقی دباؤ۔ پھر میں نے سوچا کہ ایک ایسا سنہری موقع مجھ کو مل رہا ہے جب کہ میں فلسطینی عوام کی زحمتوں اور پریشانیوں کا اپنی آنکھ سے مشاہدہ کرسکوں گا اور یہ دورہ میری صحافتی زندگی کا سب سے بہتر تجربہ بن سکتا ہے۔ دل میں یہ بھی خیال آیا کہ میں امریکہ بھی تو جاچکا ہوں اور وہ تو اسرائیل سے بھی بڑا خائن ہے (بلکہ یوں کہا جائے کہ اسرائیل کے پیچھے اگر امریکا کا ہاتھ نہ ہوتا تو اسرائیل مسلمانوں پر اتنے مظالم ڈھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا) امریکہ جاکر بھی تو میں نے اپنے قلم کو آزاد ہی رکھا تو پھر اسرائیل جانے میں کون سی قباحت ہے؟ ہندوستان سے تو لگاتار مسلمان رہبر اور دینی رہنما امریکہ جاتے رہتے ہیں اگر کچھ لوگ اسرائیل جارہے ہیں تو مجھے ان کے دورے کی رپورٹنگ کرنے میں اتنی جھجھک کیوں؟

جناب عزیز برنی صاحب نے میرے تذبذب کو دیکھ کر مجھ سے کہا کہ فیصلہ آپ پر ہے آپ اگر جانے سے گھبرا رہے ہیں تو آپ انکار بھی کرسکتے ہیں لیکن میرے خیال میں کم سے کم ایک ایسا آدمی تو وفد کے ساتھ ہونا چاہئے جس میں سچ لکھنے کی ہمت اور جس کے سینے میں ملت کا درد ہو۔ عزیز برنی صاحب کی اس بات کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے تو بس اپنے اللہ، اپنے رسولؐ، اپنے اہلبیتؑ اطہار اور اپنے ضمیر کو ہی جواب دینا ہے پھر اتنا تذبذب کس لئے؟ جس فرض کی ادائیگی کے لئے میرا ادارہ مجھے بھیج رہا ہے اس کو میں پوری ایمانداری سے نبھاؤں اور فلسطینی عوام کے درد کی صحیح تصویر پیش کروں۔ یہی جذبہ





اسرائیل نہ جانے کے تذبذب پر حاوی ہوگیا اور میں اسرائیل جانے کے لئے تیار ہوگیا۔

## دورہ کی ابتداء

13 اگست کو میں نے صبح ویزے کی درخواست دی اور شام کو ویزہ مل گیا۔ دوسرے دن تین بجے شام کو میں دہلی کے اندرا گاندھی بین الاقوامی ہوائی اڈے پر پہنچا تو وہاں چھ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے ان میں سے میں کسی سے بھی واقف نہ تھا۔ بعد میں تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک ہیں حضرت نظام الدین کی درگاہ سے وابستہ مولانا افضال نظامی، دوسرے ہیں مولانا جمیل الیاسی صاحب کے فرزند مولانا عمیر الیاسی، تیسرے ہیں مولانا حفظ الرحمان میرٹھی اور چوتھے جناب خواجہ افتخار صاحب ہیں۔ ان کے علاوہ یو این آئی کے نمائندے جناب شیخ منظور اور پی ٹی آئی کے نمائندے سید ذیشان حیدر بھی وہاں موجود تھے۔ ان سب سے مختصر تعارف کے بعد میں دہلی سے چار بجے روانہ ہوا اور چھ بجے شام کو ان لوگوں کے ہمراہ ایئر انڈیا کے ذریعہ میں بمبئی پہنچا۔ وہاں کے ہوائی اڈے پر ہماری میزبان پریہ ٹنڈن موجود تھیں (یہ محترمہ امریکن جیوش کمیٹی کی کارکن ہیں)۔ مجھے لگا کہ ان کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ جب ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ وہ امریکہ میں مجھے وزیر اعظم کے دورے کے وقت ملی تھیں۔ رات گیارہ بجے کی فلائٹ تھی۔ کڑی جانچ اور سیکوریٹی کے بارے میں تیکھے سوال سن کر مجھے یہ احساس ہوگیا کہ اس وفد کی اسرائیل میں کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہے ورنہ اتنے کڑے سوالات کی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ لوگوں سے تو آدھے آدھے گھنٹے تک اسرائیلی ایئر لائین ELAL کے ذمہ داروں اور سیکورٹی والوں نے سوالات کئے اور

جدید آلات سے سامان کی تلاشی لی۔ اس منزل سے گزرنے میں تقریباً تین گھنٹے لگ گئے۔ رات گیارہ بجے تل ابیب کی فلائٹ تھی ہم لوگ ویٹنگ لانج میں بیٹھے تھے کہ برادر محترم مولانا کلب جواد صاحب کا فون آیا اور انھوں نے میرے اسرائیل جانے پر اعتراض کیا۔ میں نے کہا کہ میں صحافی کی حیثیت سے اسرائیل جارہا ہوں اور وہاں سے لوٹ کر حق بات ہی لکھوں گا اس لئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ رات ساڑھے گیارہ بجے ہم لوگ ELAL کی فلائٹ نمبر 72 سے روانہ ہوئے اور اسرائیل کے وقت کے مطابق صبح ساڑھے چار بجے تل ابیب کے بن غریان ہوائی اڈے پر اترے۔ یہاں وفد کے ایک ممبر جناب خواجہ افتخار اور پی ٹی آئی کے نوجوان صحافی ذیشان حیدر سے اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کے لوگوں نے بہت دیر تک پوچھ تاچھ کی۔ جس سے ان دونوں حضرات کو کافی ذہنی کوفت ہوئی۔ ہوائی اڈے سے نکلتے نکلتے چھ بج گیا۔ ہوائی اڈے کے باہر مایا ٹرانسپورٹ کی ایک منی بس موجود تھی جس میں ایک اسرائیلی گائڈ رابنسن سولومن اور اشعر نام کا ایک ڈرائیور موجود تھا۔ ہوائی اڈے سے ہم کو تل ابیب کے مضافات میں موجود ایک مسلم علاقہ جعفہ کے Ruth Danial گیسٹ ہاؤس میں لے جایا گیا۔ جعفہ میں کئی عرب مردوزن سڑکوں پر نظر آئے۔ کئی مسجدیں بھی اس علاقہ میں دکھائی پڑیں۔ دوکانوں پر جو سائن بورڈ لگے تھے ان پر عربی میں دوکانوں کے نام تحریر تھے۔ جعفہ میں دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد وفد کے لوگوں کو تل ابیب میں واقع ہندوستانی سفارت خانے لے جایا گیا جہاں یوم آزادی کی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ راستے میں ہم کو ہمارے گائڈ نے بتایا کہ جعفہ میں اسرائیلی اور عرب مل کر رہتے ہیں۔ دونوں فرقوں میں کوئی تناؤ نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ اسرائیل 470 کلومیٹر کی لمبائی





میں پھیلا ہوا ملک ہے۔ جس میں 70 لاکھ افراد رہتے ہیں۔ کل آبادی کا 80 فیصد حصہ یہودیوں پر مشتمل ہے۔ باقی کے 20 فیصد لوگوں میں 17 فیصد مسلمان، دو فیصد عیسائی اور بقیہ دروز و دیگر اقلیتیں ہیں۔ ہندوستانی سفارت خانے جاتے وقت ایک شاندار مسجد بھی نظر آئی تو گائڈ نے بتایا کہ یہ مشہور سلیمانی مسجد ہے اور یہی تل ابیب کی وہ واحد مسجد ہے جہاں نماز ادا کی جاتی ہے۔ تل ابیب میں ہر طرف تعمیرات کا سلسلہ جاری ہے۔ نئے نئے مکانات بن رہے ہیں تاکہ دوسرے ممالک سے ہجرت کر کے اسرائیل میں بسنے والے یہودیوں کو آرام دہ مکان دئے جاسکیں۔ یہاں بسنے والے یہودی افراد کو بینکوں سے بہت ہی آسان شرائط پر قرض دئے جاتے ہیں تاکہ وہ لوگ آسانی سے مکان خرید کر رہ سکیں یہاں پر کوئی یہودی کرائے کے مکان میں نہیں رہتا ہے۔ صرف مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہی مکان کرائے پر لینا پڑتے ہیں۔ سالومن نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم ہے اسرائیل کا قومی پرندہ کس کو کہا جاتا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔۔۔ اس پر اس نے مسکراتے ہوئے اونچی اونچی بلڈنگوں پر مکان سازی کے کام میں لگی بلڈرس کرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہی ہمارا قومی پرندہ ہے۔

نو بجے ہم لوگ ہندوستانی سفارت خانے پر پہنچے جہاں پرچم کشائی کی تقریب میں حصہ لینے کو بہت بڑی تعداد میں ہندوستانی موجود تھے۔ ہندوستان کے سفیر جناب ارون کمار سنگھ نے ہندوستانی وفد کا استقبال کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج ہم اپنی آزادی کی 60 ویں سال گرہ منا رہے ہیں، آج ہی ہم ہندوستان کی جنگ آزادی کی پہلی لڑائی کی 150 ویں سالگرہ منا رہے ہیں اور آج ہی ہم اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم ہونے کی 15 ویں سالگرہ بھی منا رہے ہیں۔ ان کی تقریر کے بعد ہندوستان کے کچھ

فنکاروں نے مختلف قسم کے رقص پیش کئے۔ مہمانوں کی ضیافت کے لئے یہاں ہندوستانی کھانوں کا انتظام تھا۔

اس تقریب میں موجود کچھ ہندوستانی یہودیوں سے راشٹریہ سہارا کے نمائندے نے بات کی تو ان کے لہجوں میں ایک خاص قسم کا درد جھلک رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے بہت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ہم کو ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں بسنے کے لئے طرح طرح کی لالچ دی گئی اور جب ہم یہاں بس گئے تو اب ہم کو نسلی تفریق کا سامنا ہے۔ یہاں ہم کو ساتویں درجہ کا یہودی مانا جاتا ہے۔ اول درجہ کے یہودی یہاں روسی ہیں جو سب سے بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ اس ہندوستانی یہودی نے کہا کہ ہم جس کو گمشدہ فردوس سمجھ کر آئے تھے وہ ہمارے لئے جہنم بن گیا ہے۔ واضح رہے کہ اسرائیل میں تقریباً 70 ہزار ہندوستانی یہودی آباد ہیں۔ جو مہاراشٹر، بنگال اور کیرالا سے ہجرت کر کے وہاں گئے ہیں۔





# یروشلم اور ہم

تل ابیب میں واقع ہندوستانی سفارت خانے سے ہماری بس تقریباً گیارہ بجے دن میں یروشلم کے لئے روانہ ہوئی۔ منی بس نے بحر روم کے کنارے کنارے اپنا سفر شروع کیا تو ہم کو نیم برہنہ خواتین اور فحش لباس میں اسرائیلی لڑکیوں کی ٹولیاں ساحل پر دھوپ سینکتی نظر آئیں۔ ہماری بس ایک گھنٹے کے سفر کے بعد یروشلم میں داخل ہوگئی۔ پورا یروشلم شہر چھوٹی بڑی پہاڑیوں پر بسا ہوا ہے۔ کہیں بھی کوئی میدانی علاقہ ہم کو نظر نہیں آیا۔ گھماؤ دار پہاڑی راستے، خوبصورت وادیاں، سرو کے اونچے اونچے درخت اور سبزے سے ڈھکے پہاڑ نہایت پرکشش لگ رہے تھے۔ ساری بلڈنگیں اور مکان کریم کلر کے نظر آرہے تھے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مصور اپنے رنگ کی بالٹی پورے شہر پر انڈیل کر چلا گیا ہو۔ میں نے سولومن سے تمام مکانوں کے کریم کلر کے ہونے کی وجہہ پوچھی تو سولومن کوئی خاص وجہہ نہیں بتا سکا۔ اس نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ یہاں روایت یہ رہی ہے کہ سارے مکان Lime Stone کے بنائے جاتے ہیں۔ اس پتھر کو سنگ یروشلم بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ کئی سو سال سے یہاں یہی روایت چلی آرہی ہے کہ مکانوں کے در و دیوار سنگ یروشلم کے بنائے جاتے ہیں۔ یہاں دیواروں کو رنگنا معیوب سمجھا جاتا رہا ہے۔ (سنگ یروشلم کو عربی زبان میں حجر مالکی کہا جاتا ہے) 1918 میں انگریزوں کے ایک گورنر Ronald Storrs نے ایک حکم کے ذریعہ اس بات کو یقینی بنایا تھا کہ یروشلم کے کسی بھی مکان یا بلڈنگ کا باہری حصہ سنگ یروشلم کے علاوہ کسی دوسرے پتھر سے نہیں بنایا جائے گا۔

صیہونی دہشت گردی

تھوڑی دیر اونچے نیچے راستوں سے گزرتے ہوئے ہم لوگ وہاں کے مشہور ہوٹل یروشلم ریجنسی میں پہنچ گئے۔ مجھے 720 نمبر کمرہ ملا۔ کمرے میں پہنچتے ہی جیسے ہی میں کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو فرطِ مسرت سے میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ سامنے وہ سنہرا گنبد موجود تھا جس کی تصویریں بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ آنکھوں میں بے اختیارانہ آنسو آ گئے۔

مسجد اقصیٰ پہ پڑتے ہی نظر
دل مرا آنکھوں میں کھنچ کر آ گیا

کھڑکی کا دروازہ کھول کر بالکونی کی چھت پر جایا جا سکتا تھا۔ میں نے بجلی کی رفتار سے دروازہ کھولا اور چھت پر پہنچ کر دیر تک مسجد اقصیٰ پر نظریں جمائے رہا۔ پھر جلدی جلدی تیار ہوکر ہوٹل کی لابی میں پہنچا جہاں یہودیوں کے مذہبی رہنما ڈیوڈ روزن ہندوستانی وفد کے منتظر تھے۔ ڈیوڈ روزن امور بین المذاہب کے انٹرنیشنل ڈائرکٹر ہیں۔ انھوں نے وفد میں شامل لوگوں کا خیر مقدم کیا اور امن کے قیام کے لئے اسرائیلی عوام کی دلی خواہش کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اسرائیل کے عوام چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ اب مثبت ڈائیلاگ کے دروازے کھولے جانے چاہیئے۔ اس خطے کو دیرپا امن کی ضرورت ہے۔ ڈیوڈ روزن نے کہا کہ اگر اب بھی امن نہیں ہوا تو شائد دنیا کو ایک بڑی جنگ سے دوچار ہونا پڑے۔ ڈیوڈ روزن نے کہا کہ اسرائیل کے یہودی امن کے خواہاں ہیں اور اگر مسلمان ممالک دوقومی نظریہ کو مان لیں تو اسرائیل بھی اپنی پالیسی میں تبدیلی لا سکتا ہے۔ پہلی بار کسی اسرائیلی کے منھ سے امن کی بات سن کر تعجب ہوا ورنہ اسرائیلی تو ہمیشہ طاقت کے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بات کرتے رہے ہیں۔ یہ تبدیلی اچانک کیسے آئی اس کا





اندازہ لگانا آسان تھا پھر بھی میں نے مناسب سمجھا کہ یہ مذہبی آدمی ہیں ان سے سیاسی سوال کرنا مناسب نہیں اس لئے خاموشی سے ڈیوڈ روزن کی بات سنتا رہا ویسے بھی میرا دل صرف مسجد اقصیٰ کی زیارت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں جلد از جلد بیت المقدس کے لئے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ ڈیوڈ روزن سے ملاقات کے بعد ہمارے گائڈ سالومن نے کہا کہ ابھی آپ لوگ آرام کرلیں پھر شام کو ہم سب مسجد اقصیٰ چلیں گے لیکن سب لوگ اس بات پر بضد تھے کہ دوپہر کو آرام کرنے کے بجائے ہم کو بیت المقدس میں نماز کی ادائیگی کے لئے جانا ہے۔ سب لوگ ہوٹل سے یروشلم کے فصیل بند شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں دوطرح کا یروشلم دیکھنے کو ملا۔ مغربی علاقہ سے گزرتے وقت ہم کو امریکہ کی برہنہ تہذیب کا نمونہ دیکھنے کو مل رہا تھا۔ ہر طرف کم سے کم کپڑوں میں ملبوس خواتین نظر آ رہی تھیں تو اسی علاقہ میں اسرائیل کے قدامت پسند یہودی مرد سیاہ کوٹ، سیاہ پینٹ، سیاہ ہیٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس جوق در جوق گھومتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے بڑی بڑی داڑھیاں رکھی ہوئی تھیں اور کاکلیں بھی بڑھائی ہوئی تھیں جو کم قدامت پسند تھے وہ سر پہ یہودیوں کی مخصوص گول ٹوپی چپکائے ہوئے تھے جس کو بالوں میں ایک کلپ سے پھنسایا گیا تھا۔ ہم مغربی شہر میں سے ہوتے ہوئے مسجد اقصیٰ کی پشت کی طرف ایک پہاڑی پر بس سے اترے۔ اس کے بعد سیکوریٹی کے سخت انتظامات کے تحت ایکسرے کی مشینوں سے گزرتے ہوئے دیوار گریہ کی طرف پہنچے۔ دیوار گریہ مسجد اقصیٰ کے ٹھیک نیچے واقع ہے۔ اس دیوار کے قریب سینکڑوں یہودی توریت پڑھنے میں محو تھے۔ توریت پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ تیز تیز ہل بھی رہے تھے۔ (مجھے یہودیوں کو ہلتے دیکھ کر ہندوستانی مدرسوں کے وہ بچے یاد آئے جو سبق یاد

کرتے وقت ہلتے رہتے ہیں) مختلف یہودی مرد وزن دیوار گریہ کے قریب اشک افشانی میں بھی لگے تھے۔ ہمارے یہودی گائڈ سالومن نے بتایا کہ کسی زمانے میں یہاں (جہاں آج مسجد اقصیٰ ہے) یہودیوں کی سب سے اہم عبادت گاہ Temple Mount قائم تھی حالانکہ انجیل مقدس کے حوالوں کے مطابق یہودیوں کی سب سے متبرک عبادت گاہ جبل صہیون پر واقع تھی جس کو سکندر اعظم کے وارث رومی لشکریوں نے نیست و نابود کر دیا۔ اسی مندر کی یاد میں یہودی دیوار گریہ کے قریب جمع ہو کر اشک افشانی کرتے ہیں۔

مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ یہاں پر یہودیوں کی کوئی عبادت گاہ کبھی تھی ہی نہیں۔ پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ کی تعمیر کے چار سال بعد فلسطین کے قدس شہر میں مسجد اقصیٰ کی بنیاد ڈالی تھی جس کو بعد میں یہودیوں اور پھر عیسائیوں نے اپنی عبادت گاہ میں تبدیل کر لیا تھا۔ دیوار گریہ کے پاس اک چھوٹا سا دروازہ ہے جس کو مغربی در کہا جاتا ہے۔ اس دروازے سے بیت المقدس کے اندر داخل ہوا جا سکتا ہے۔ اس دروازے تک پہنچنے کے لئے اسرائیل کی حکومت نے ایک لکڑی کا پل بنا رکھا ہے جس سے ایک مقررہ وقت پر یہودی مسجد کے صحن میں داخل ہوتے ہیں اور دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ اسی پل کو اسرائیل کی حکومت ایک فلائی اوور میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی تھی تب یروشلم کے مسلمان باشندوں نے سخت احتجاج کر کے بہت سی قربانیاں دیں اور اس طرح اسرائیل کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

ہم لوگ دیوار گریہ کے قریب تک گئے اور وہاں یہودیوں کو عبادت کرتے ہوئے قریب سے دیکھا۔ دیوار گریہ کی پتھر سے بنی دیواروں کی درازوں میں یہودیوں نے حاجات پوری ہونے کے لئے ہزاروں پرچیاں ٹھوس رکھی ہیں۔ یہ منظر دیکھنے کے بعد





واپس اونچی چڑھائی طئے کر کے سب لوگ شمالی راستے سے اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے ایک پتلی سی گلی سے گزر کر مسلم تہذیب کے درمیان پہنچ گئے جہاں اسکارف میں ملبوس مسلم خواتین، لمبے کرتے نما ملبوس (جس کو ثوب کہا جاتا ہے) پہنے ہوئے نورانی چہروں والے بزرگ، پینٹ شرٹ اور جینس میں ملبوس عرب نوجوان ہر طرف نظر آنے لگے۔ کہیں کباب کے اسٹال تھے تو کہیں تسبیح اور جانماز ہدیہ کرنے والوں کی دوکانیں لگی تھیں۔ عربی ظروف، زیور، سجاوٹ کا سامان، چھوٹے چھوٹے تحائف، حقہ، شیشے کا سامان اور طرح طرح کے ملبوسات بیچنے والوں کی لا تعداد دوکانیں بھی یہاں موجود تھیں۔ یروشلم اسٹون سے بنی دیواروں کے ساتھ ساتھ یہاں کی گلیوں کی زمین بھی اسی پتھر سے بنی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ دو تہذیبوں کا زبردست تضاد اس شہر میں صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ اسرائیلی علاقہ میں سیاحوں کی بھیڑ تھی لیکن مشرقی شہر کی دوکانوں میں خاک اڑ رہی تھی۔ کیوں کہ یہاں مسلم ٹورسٹ برائے نام ہی آتے ہیں۔ صرف مقامی مسلمان ہی یہاں سے اپنی ضروریات کا سامان خریدتے ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی طرف جانے والی پتلی پتلی گلیوں میں تھوڑی تھوڑی دور پر اسرائیلی فوجی تعینات تھے جو ہر آنے جانے والے کا شناختی کارڈ یا پاسپورٹ چیک کر رہے تھے۔ اصل میں مسجد اقصیٰ کے اندر کسی بھی غیر مذہب کے انسان کو جانے کی اجازت نہیں ہے صرف مسلمان ہی یہاں داخل ہو سکتے ہیں۔ (یہودی لوگ البتہ ایک مقررہ وقت میں صرف مغربی دروازے سے داخل ہو سکتے ہیں) اسرائیل کی فوج نے وفد والوں کے پاسپورٹ چیک کئے اور اس بات کا اطمینان کر لینے کے بعد کہ ہم سب مسلمان ہیں ہم لوگوں کو مسجد میں جانے کی اجازت دے دی لیکن پریہ ٹنڈن اور سالومن کو فوجیوں نے اندر جانے کی اجازت نہیں دی۔ ہم

لوگ باب القطانین یعنی روئی بیچنے والوں کی دوکانوں والے دروازہ سے مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے ( حالانکہ وہاں اب روئی کی کوئی دوکان نہیں ہے ) ۔ مسجد اقصیٰ کے دو حصہ ہیں ایک میں تو حضرت ابراہیمؑ کی تعمیر کردہ بیت المقدس کی بنیادیں موجود ہیں جس کے اوپر مسلم فرماں رواں صلاح الدین ایوبی کی بنوائی ہوئی مسجد ہے اور باب القطانین کے ٹھیک سامنے وہ جگہہ ہے جہاں شب معراج میں ہمارے پیارے نبیؐ کا براق اترا تھا۔ اس جگہ کو قبہ الصخرہ (Dome of the Rock کہتے ہیں۔ ان دونوں مقامات کے بیچ میں دور تک لق ودق صحن ہے جس میں سرو ( مور پنکھی ) کے بے شمار تناور درخت لگے ہوئے ہیں۔ اتنے اونچے سرو کے درخت میں نے تو اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھے تھے۔ ابابیلوں کے جھنڈ مسجد کے چاروں طرف چکر لگا رہے تھے شائد اپنی زبان بے زبانی میں کعبہ کے ساتھ اپنے پرانے رشتے اور ابرہہ کے لشکر کی بربادی کی علامت کے بطور مسلمانوں کے دلوں کو دلاسہ دے رہے تھے۔

ہم نے جلدی جلدی وضو کیا اور نماز کے لئے مسجد کے اندر پہنچ گئے۔ اس وفد میں گو کہ تین مسلمان علماء موجود تھے لیکن ان میں سے کسی کو سفر کے دوران نماز کے قصر ہونے کی صحیح معلومات نہیں تھیں ایک صاحب نماز پڑھانے کھڑے ہوئے تو انھوں نے ظہر کی چار رکعت پڑھا دی جب کہ سب نے قصر کی نیت کی ہوئی تھی۔ بعد میں دوسرے صاحب نے قصر نماز پڑھائی ایسے عالم میں مجھے تو یہی بہتر لگا کہ جماعت کے بجائے منفردہ کی نیت سے نماز ادا کی جائے۔ نماز کے بعد ہم لوگ قبہ الصخرہ کے اندر گئے۔ اس پہاڑی چٹان کے اوپر ایک خوبصورت سی عمارت بنا دی گئی ہے جس کا سنہری گنبد دور دور سے نظر آتا ہے۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے وہ چٹان دکھائی پڑی جہاں





رسولؐ نے اپنا براق ٹھرایا تھا اس چٹان کو ہاتھ سے چھو کر ایسا لگا کہ جیسے بدن میں عقیدت کی ایک لہر موجزن ہوگئی۔ اسی چٹان کے اندر ایک غار ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنی ہیں۔ سیڑھیوں سے اتر کر ہم اس مبارک غار میں پہنچے جہاں حبیب خدا نے شب معراج نماز پڑھی تھی بڑا روحانی منظر تھا۔ ہر طرف عورتیں اور بچے تلاوت کلام پاک میں مصروف تھے۔ کچھ بزرگ اور نوجوان نمازوں میں محو تھے یہاں تکبیر کی آوازوں کے علاوہ کوئی دوسری آواز سنائی نہیں پڑ رہی تھی۔ یہاں ہم لوگوں نے سنت نمازیں ادا کیں۔ اور پھر باہر نکل آئے

## زخمی سانپ سے ملاقات

شام کو وفد کے لوگوں کو Canella ریسٹورنٹ میں ایک اہم ترین اسرائیلی افسر سے ملاقات کے لئے لے جایا گیا۔ اس افسر کا نام عران لرمین تھا۔ یہ افسر کسی زمانے میں اسرائیل کی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی موساد کا ایک اہم ترین افسر تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ شخص حزب اللہ کے خلاف محاذ آرائی کا نگراں بھی تھا۔ عران لرمین نے اپنی گفتگو کا آغاز بڑے دلچسپ انداز میں کیا۔ اس نے کہا کہ اصل میں مسلمانوں کی تمام پریشانیاں اس لئے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ اسلامی سیاست کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اسی کے سبب حسن البناء اور شہید قطب جیسے لوگوں کے انتہا پسندانہ نظریات مسلمانوں میں عام ہونے لگے۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے سبب ایران جیسے ممالک کو اسلامی سیاست میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ ایران نے اسلام کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اب حزب اللہ اسلام کی تعلیمات کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ عران لرمین کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میرے دل میں ایک تلاطم مچا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ حزب اللہ کے ساتھ جنگ میں جو

سانپ زخمی ہو گیا ہے وہ درد سے تڑپ رہا ہے ورنہ یہودی اور اسلام کی خیر خواہی؟ چہ معنی
دارد؟ عران لرمین نے آگے کہا کہ عرب اسرائیل تنازعہ ختم ہو چکا ہے اب لڑائی تو ایران و
اسرائیل کے درمیان ہے۔ ایران حزب اللہ کی مدد کر رہا ہے اس لئے خطہ میں امن کی
صورتحال بگڑ رہی ہے۔ اس پر میں نے عران سے سوال کیا کہ جنوبی لبنان میں رہنے والے
فلسطینی مہاجرین کو وہاں سے نکالنے کیلئے اسرائیل نے جو فوج کشی کی تھی کیا اس کے لئے
آپ کو حزب اللہ نے مجبور کیا تھا؟ اس پر لرمین بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے پھر پوچھا کہ کیا
جنوبی لبنان میں اپنی فوجیں بٹھا کر رکھنے کے فیصلے کے سبب حزب اللہ نے مجبور ہو کر آپ
کے خلاف مورچہ کھولا یا انھیں شوق تھا آپ سے لڑنے کا؟ تو عران لرمین بولا کہ ہاں ہم
سے اس معاملے میں غلطی ہوئی تھی اصل میں ہمارے عیسائی بھائیوں نے ہم سے
درخواست کی تھی کہ ہم جنوبی لبنان میں ٹھہر جائیں یہی فیصلہ ہم کو مہنگا پڑا۔ عران لرمین نے
کہا کہ اصل میں سارے فساد کی جڑ شیعہ ہیں اور وہی مشرق وسطیٰ کا ماحول بگاڑ رہے ہیں۔
جب میں نے عران لرمین سے دریافت کیا کہ حماس اور فتح الاسلام کے مجاہدین بھی کیا شیعہ
ہیں؟ تو اس نے کہا نہیں یہ لوگ شیعہ تو نہیں ہیں لیکن شیعہ ان کی مدد کر رہے ہیں۔ لرمین
نے اسی بیچ یہ بھی کہا کہ آپ تو واقف ہوں گے ہی کہ ہند کے شہر لکھنو میں بھی شیعہ سنی جھگڑا
ہوتا ہے۔ جس کی وجہ وہاں ایران کا بڑھتا ہوا تسلط ہے عران نے یہ بھی کہا کہ لکھنوء میں
امام خمینی کی تقلید کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اس لئے وہاں فساد ہوتا ہے۔ اس پر میں
نے اس کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ لکھنوء میں تو شیعہ سنی فساد کی تاریخ ایک صدی سے بھی زیادہ
پرانی ہے اس میں ایران کا رول کہاں سے آ گیا؟ لکھنوء میں سب سے بڑا شیعہ سنی فساد
ایران کے اسلامی انقلاب سے دو سال پہلے 1977 میں ہوا تھا اسلامی انقلاب کے بعد





کوئی بھی بڑا فساد نہیں ہوا۔ بلکہ شیعہ سنی فرقہ کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں۔
اس بیچ وفد کے کسی ممبر نے میری طرف اشارہ کر کے یہ کہہ دیا کہ یہ بھی لکھنؤ کے ہیں۔ اس
پر عران لرمین نے فوراً بات بدل دی۔ وہ احمدی نژاد اور دیگر ایرانی لیڈروں کو برا کہنے لگا۔
عران نے کہا کہ آج کی ایرانی لیڈرشپ اسرائیل کے خاتمہ کی بات کرتی ہے کیا کوئی
مہذب ملک ایسا سوچ سکتا ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ اسرائیل بھی تو کئی مسلم ممالک کو تباہ
کر کے گریٹر اسرائیل کے قیام کی بات کرتا ہے، کیا یہ ایک مہذب ملک کی پہچان ہے؟ تو
اس پر عران نے تلملا کر کہا یہ بالکل سفید جھوٹ ہے ہم گریٹر اسرائیل کی بات نہیں
کرتے (حالانکہ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ سفید جھوٹ بول رہا تھا)
جب میں نے اس سے کہا کہ کیا یہ بھی غلط ہے کہ اسرائیل کے قومی پرچم پر دو دریاؤں کے
درمیان جو اسٹار آف ڈیوڈ دکھایا گیا ہے وہ آپ کے گریٹر اسرائیل کے خواب کی نشان دہی
نہیں کرتا؟ اس پر عران لرمین نے کہا کہ نہیں یہ سچ نہیں ہے ہمارے پرچم پر جو نیلی
لکیریں ہیں وہ اللہ سے قربت کا اشارہ کرتی ہیں۔ ظاہر ہے اس کے پاس کوئی بہانہ یا جواز
نہیں تھا جو وہ میری باتوں کی رد میں پیش کرتا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی گفتگو کے دوران ایک ہی بات پر زور دے رہا ہے کہ سنی
عوام امن پسند ہیں سارے ہنگامے کی جڑ تو شیعہ ہیں۔ جب میں نے اس سے کہا کہ
القاعدہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کیا وہ بھی شیعہ تنظیم ہے؟ تو وہ بولا کہ وہ لوگ
گمراہ ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ عراق کے سابق صدر صدام حسین کے بارے میں آپ
کا کیا خیال ہے؟ تو وہ فوراً بات ٹال گیا۔

ایک ہندوستانی صحافی نے اس سے کہا کہ ایک امریکی صحافی نے حزب اللہ کے ساتھ

ہونے والی جنگ میں جو Rating دی ہے اس کے مطابق حزب اللہ کو تین نمبر دئے
اور اسرائیل کو صفر دیا۔ تو عران لرمین نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے کہا کہ ایسا نہیں ہم اس
جنگ میں بہت کامیاب رہے ہیں۔ ہم نے گوریلا جنگ میں مہارت رکھنے والی دنیا کی
سب سے بہتر تنظیم حزب اللہ کے سب سے بہترین گوریلے مار دئے جس سے ان کی کمر
ٹوٹ گئی۔ ہم نے چوبیس گھنٹے میں حزب اللہ کے لانگ رینج میزائل کے سارے اڈے
تباہ کر دئے۔ (حالانکہ یہ سفید جھوٹ تھا) ہم نے نصر اللہ کی جادوئی امیج کو ختم کر دیا۔
اب وہ لبنان میں بالکل مقبول نہیں ہیں۔ (یہ بھی ایک اور سفید جھوٹ تھا) ہم نے
حزب اللہ کو اقتصادی طور پر توڑ کر رکھ دیا۔ اگر ان کے پانچ سپاہی شہید ہوئے تو ہمارا
ایک سپاہی ہلاک ہوا (حالانکہ اسرائیل کی فوج کے سربراہ کی معزولی اس بات کی غماز
ہے کہ اسرائیل نے حزب اللہ کے ساتھ لڑائی میں زبردست مات کھائی ہے) جب اسی
ہندوستانی صحافی (ذیشان حیدر) نے پوچھا کہ آپ نے جن فوجیوں کو چھڑانے کے لئے
جنوبی لبنان پر حملہ کیا تھا، وہ تو آج بھی حزب اللہ کے پاس ہیں تو آپ کو جنگ میں کیا
ملا؟ آپ ان کی شرائط مان کیوں نہیں لیتے؟ تا کہ آپ کے فوجی رہا ہو جائیں۔ اس پر
عران لرمین نے کہا کہ اگر ہم حزب اللہ کی شرائط مان لیں گے تو وہ فتحیاب ہو جائیں گے
لیکن عران لرمین نے اس بات کا اقرار کیا کہ جنوبی لبنان میں اسرائیل کی پسپائی نے
حزب اللہ کے حوصلے بڑھائے ہیں۔

اپنی گفتگو کے دوران عران لرمین نے حماس کے لیڈر عباس ہانیہ کی کڑی مذمت کی اور
نئے وزیر اعظم سلام فیاض اور صدر عباس محمود کی خوب جم کر تعریف کی۔ اس نے کہا کہ
اردن اور مصر بھی اسرائیل کے نظریات سے متفق ہیں اور کچھ دوسرے عرب ممالک بھی





ہماری باتوں سے اتفاق رکھتے ہیں لیکن ان کا نام ہم نہیں لے سکتے۔ عران لرمین نے کہا
کہ اس وقت خطے میں ہمارے صرف چار دشمن ہیں یعنی ایران، حزب اللہ، حماس اور
شام۔ باقی ممالک ہمارے ساتھ تعاون کے خواہاں ہیں، ہماری امیج مسلمانوں کی نظر
میں تبدیل ہوئی ہے۔ اس پر اسرائیلی افسر سے میں نے پوچھا کہ اگر آپ کا یہ دعویٰ
درست ہے کہ آپ مسلمانوں میں بہت مقبول ہو رہے ہیں تو برصغیر میں آپ کے خلاف
بے انتہا نفرت کیوں ہے؟ وہاں کے مسلمان اسرائیل سے اس قدر متنفر کیوں ہیں کہ
ایک وفد کے آنے پر پورے ملک میں احتجاج ہو رہا ہے؟ اس پر عران نے کہا کہ وہ لوگ
جہالت اور عدم معلومات کی وجہہ سے گمراہی کا شکار ہیں۔ جب میں نے اس سے کہا کہ
مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی شیطانی حرکتیں ہی ہر طرح کے فساد کی ذمہ دار ہیں تو اس نے
جھٹ سے کہا کہ امریکہ کی پالیسیوں کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ امریکا
مسلمان ممالک میں جمہوریت قائم کرنا چاہتا ہے تا کہ مسلمان اپنی پسند کے حاکم چن
سکیں۔ اس پر میں نے کہا کیا امریکا عرب کے مطلق العنان حکمرانوں اور بادشاہوں کو
ہٹانے کی فکر کر رہا ہے؟ تو اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا کہ کچھ بھی ہو، ہم کو امریکا کی
دوستی پر ناز ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔ آخر میں میں
نے عران لرمین سے پوچھا کہ کیا اسرائیل کی حکومت فلسطینی عوام کو خوش کرنے کے لئے
فلسطین کے مقبوضہ علاقوں سے ہٹ جائے گا؟ تو عران نے بہت صاف گوئی سے کام
لیتے ہوئے کہا کہ ہم مقبوضہ فلسطینی علاقوں سے ہٹ نہیں سکتے کیوں کہ وہاں سے اسرائیلی
بستیوں پر میزائل اور راکٹ داغے جاتے ہیں۔ میرے اس سوال پر کہ کیا مسجد اقصیٰ کو
مسلمانوں کے حوالے کئے بغیر خطے میں امن قائم ہو سکتا ہے؟ اس نے کہا کہ ہم

اسرائیلیوں کے لئے یہ باعث شرف ہے کہ ہم القدس کے محافظ ہیں۔ یہ اعزاز ہم کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ ہم مسجد اقصیٰ کی نگہبانی کرتے رہیں گے۔

اس مختصر سی گفتگو میں اسرائیل کی امن کی خواہشوں کی پوری پول عران لرمین نے کھول دی۔ اس کے بیان سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ مسجد اقصیٰ پر اپنے ناپاک قبضہ کو برقرار رکھنے کے لئے یہودی سیاست دانوں نے کیسے کیسے حیلہ تراشے ہیں؟ اس گفتگو سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اسرائیل کے سیاستداں دنیا بھر میں شیعہ سنی کشیدگی پیدا کر کے اپنا الوسیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ اسرائیل کے رہبروں کو لکھنؤ جیسے چھوٹے شہر کے شیعہ سنی فساد میں کتنی دلچسپی ہے اس بات کا اندازہ تو قارئین کو ہو ہی گیا ہوگا۔ عران لارمین کو یہاں تک معلوم تھا کہ لکھنوء میں آیت اللہ العظمیٰ علی خامنہ ائی کے کتنے مقلد ہیں اور کتنے شیعہ حضرات آیت اللہ سیستانی کی تقلید میں ہیں۔ جب ان صہیونیوں کو شیعہ سنی معاملات میں اتنی دلچسپی ہے تو کیا تعجب کہ لکھنو میں شیعہ سنی فساد کروانے کے لئے وہ دونوں فرقوں کے مفسد لیڈروں میں پیسہ بھی تقسیم کرتے ہوں؟





# اسرائیلی پارلیمنٹ میں

دورے کے دوسرے دن ہندوستانی وفد سے ملاقات کے لئے فلسطین میں آباد نقشبندی سلسلے کے ایک عالم دین شیخ عبدالعزیز بخاری صبح صبح ہوٹل آئے اور وفد کے ساتھ ناشتہ کی ٹیبل پر تشریف فرما ہوئے۔ ان کے تعارف میں یہودی تنظیم نے کہا کہ شیخ صاحب یروشلم میں ازبیک کمیونٹی کے ایک اہم رہبر ہیں اور ان کا خانوادہ سن 1616 میں ازبیکستان کے بخارہ شہر سے ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہوا تھا۔ ان کے بارے میں یہ بھی بتایا گیا کہ وہ امام بخاری کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے حدیث رسولؐ کی بہت ہی مستند کتاب صحیح البخاری تحریر کی تھی۔ ان کے لئے یہ بھی بتایا گیا کہ وہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان بہتر تعلقات بنانے میں ایک پل کا کردار نبھا رہے ہیں۔ شیخ عبدالعزیز بہت گرم جوشی سے ملے اور دن بھر کے لئے وفد کے ساتھ ہو لئے۔

اس کے بعد ہندوستانی وفد اسرائیل کی پارلیمنٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ جہاں وفد کو لیبر پارٹی اور بائیں بازو کی Meretz پارٹی کے ممبر پارلیمنٹ سے ملنا تھا۔ اسرائیل کی پارلیمنٹ کو Knesset کہا جاتا ہے اس کے ممبروں کی تعداد کل ایک سو بیس ہے جس میں ایک مسلمان ممبر بھی شامل ہے۔ اسرائیل میں امیدوار الیکشن نہیں لڑتے بلکہ پارٹیاں انتخاب میں اترتی ہیں اور جس پارٹی کو جس تناسب میں ووٹ حاصل ہوتے ہیں اس کو اتنی ہی سیٹیں الاٹ کردی جاتی ہیں۔ پھر پارٹی ان سیٹوں کے لئے اپنے ممبر نامزد کردیتی ہے۔ جس پارٹی کو سب سے زیادہ ووٹ ملتے ہیں وہی حکومت سازی کا دعویٰ کرتی ہے۔

وہاں پہنچتے ہی ہندوستانی وفد کی ملاقات ممبر پارلیمنٹ اور ربائی (یہودی مذہبی رہنما) مائیکل میلیچر سے ہوئی انھوں نے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی کہا کہ ساری دنیا یہ سمجھ رہی ہے کہ یروشلم میں یہودی اور مسلمان لڑ رہے ہیں، ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں، یہ بات بالکل غلط ہے آپ کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ یہاں پر آپس میں خوب دوستی ہے۔ مائیکل میلیچر نے کہا کہ دراصل یہ مذاہب کا جھگڑا ہے ہی نہیں یہ قومیت کا تصادم ہے۔ ربائی مائیکل میلیچر کا یہ دعویٰ مجھ کو بڑا مضحکہ خیز لگا کیوں کہ اسرائیل کا قیام مذہب کے نام پر ہی ہوا ہے لیکن اب معاملے کو اسلام اور صیہونیت کی جنگ میں بدلتے دیکھ کر یہ لوگ قومیت کی بات کر رہے ہیں۔ جب میں نے ان سے سوال کیا کہ کیا اسرائیل حماس سے اس لئے ناراض ہے کہ حماس اسلام کا نام لیتی ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ حماس کی جو پالیسی ہے اس کے مطابق اسرائیل کا وجود نہیں رہ جائے گا اور اس سرزمین پر ایک یہودی کو دفن ہونے تک کی اجازت نہیں ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ اگر حماس اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کا خیال دل سے نکال دے تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ فلسطینیوں کو ان کے حقوق مل جائیں گے۔ اسرائیلی ممبر پارلیمنٹ کے لہجے میں اتنی نرمی دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ حزب اللہ کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ان کا دماغ کسی حد تک ٹھکانے پر آ گیا ہے ورنہ اسرائیل میں تکبر اور طاقت کا زعم ہی بات کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ ربائی مائیکل میلیچر کوئی معمولی سے ممبر پارلیمنٹ نہیں ہیں وہ لیبر پارٹی کے دور میں کئی بار مختلف وزارتیں سنبھال چکے ہیں اور وزارت خارجہ میں بھی نائب وزیر رہ چکے ہیں۔ ان کے دور میں یہ مسئلہ حل کیوں نہیں ہوا اس کا وہ کوئی معقول جواب نہیں دے سکے۔ ایران کے بارے میں پوچھے گئے ایک سوال پر انھوں نے کہا کہ ایران کے صدر محمود احمدی نژاد کو اسرائیل کے





خاتمہ کی بات چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ اگر ایران اسرائیل کی تباہی کی بات کرتا ہے تو صیہونی بھی کئی مسلم ممالک کو مٹانا چاہتے ہیں کیوں کہ گریٹر اسرائیل کا جو نظریہ ہے اس کے مطابق اسرائیل کی سرحدیں دریائے فرات سے لے کر دریائے نیل تک مانی گئی ہیں۔ جس کا ایک خاکہ آپ کے قومی پرچم پر بھی بنا ہوا ہے جس میں دو دریاؤں کے بیچ اسٹار آف ڈیوڈ دکھایا گیا ہے اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ان دو دریاؤں کے بیچ کون کون سے اسلامی ممالک آتے ہیں جن کو اسرائیل تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اس پر کینسٹ کے ممبر نے کہا کہ نہیں یہ سچ نہیں ہے، اسرائیل کے 70 فیصد لوگ ایسا نہیں چاہتے وہ امن کے خواہاں ہیں۔

مائیکل میلیچر کے بعد اسرائیل میں بائیں بازو (حزب اختلاف کے) ایک ممبر پارلیمنٹ رین کوہن ہندوستانی وفد سے ملنے کے لئے آئے۔ انھوں نے آتے ہی پہلا جملہ یہ کہا کہ اسرائیل میں لوگ مجھ کو غدار کہتے ہیں کیوں کہ میں کھلے طور پر اس بات کی وکالت کرتا ہوں کہ اسرائیل کو مقبوضہ علاقے خالی کر دینا چاہیئے کیوں کہ امن صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک اسرائیل کی فوجیں 1967 کی سرحد پر واپس نہیں جاتیں اس خطہ میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اس بات کی بھی وکالت کی کہ یروشلم کو دو راجدھانیوں میں تقسیم کر دیا جانا چاہیئے۔ بہت زیادہ کھلی باتیں کرنے کے باوجود وہ حزب اللہ اور ایران کے سخت مخالف نظر آئے۔ ایک ہندوستانی صحافی کے اس سوال پر کہ اسرائیل اپنے فوجیوں کو چھڑانے کے لئے کیا کر رہا ہے؟ انھوں نے برافروختہ ہو کر جواب دیا کہ ہم اپنے ایک فوجی کے لئے دشمن کے ایک ہزار فوجی رہا کر سکتے ہیں لیکن ہم حزب اللہ سے بات نہیں کر سکتے آپ ان سے بات کر کے ہمارے فوجیوں کو رہا کروا سکتے ہوں تو رہا کروا دیں۔

کوہن نے بھی ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کے خلاف زہر اگلا اور شام کے صدر بشیر الاسد کو مشورہ دیا کہ وہ ایران سے تعلقات ختم کر لیں۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ امریکہ امن مذاکرات سے شام کو الگ رکھنا چاہتا ہے جو ایک بڑی حماقت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسرائیل کو گولان کی پہاڑیوں سے فوری طور پر ہٹ جانا چاہیئے کیوں کہ امن کا یہی آخری موقع ہے، ورنہ ایک اور جنگ چھڑ سکتی ہے جو بہت تباہ کن ہوگی۔

## چند گھنٹے مسلمانوں کے بیچ

کینسٹ کے ممبروں سے ملاقات کے بعد ہندوستانی وفد کو یروشلم کے نزدیک واقع ابوغوش نام کے ایک مسلم گاؤں میں لے جایا گیا۔ یہ علاقہ عرب کے خوش مزہ پکوان تیار کرنے والے ہوٹلوں کے لئے سارے اسرائیل میں مشہور ہے اور یہاں شام کے وقت اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ پارکنگ کے لئے جگہ ملنا دشوار ہوتی ہے۔ ابوغوش میں سات ہزار مسلمان رہتے ہیں۔ یہاں پر تقریباً بیس پچیس ہوٹل ہیں جو اپنے گاہکوں کی تواضع عرب کے لذیذ پکوانوں سے کرتے ہیں لیکن کسی ہوٹل میں جانے کے بجائے ہندوستانی وفد دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے ایک مسلم خانوادہ کا مہمان ہوا۔ عیسیٰ جابر نام کے ترکی النسل مسلمان میزبان نے اپنے پر فضا گھر میں عرب اور ترکی کے ملے جلے کھانوں سے وفد کی ضیافت کی۔ عیسیٰ جابر اسرائیل کی بین المذاہب ہم آہنگی کمیٹی کے نائب صدر ہیں۔ عیسیٰ جابر کے گھر میں انگوروں کی بیل اور نیلے رنگ کے خوش ذائقہ پھل Plums لگے تھے۔ گھر بے حد ہوا دار تھا اور ایک پہاڑی پر بنا تھا جہاں سے نیچے کا منظر بہت پر لطف لگ رہا تھا۔ عیسیٰ جابر سے جب بات کی تو انھوں نے کہا کہ 1948 سے 1967 تک زندگی بہت دشوار رہی لیکن اب اتنی پریشانیاں نہیں ہیں۔ ہم یہاں امن کے ساتھ رہتے ہیں۔ مسلمان اور یہودی بچے یہاں





ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ ہم کو یہاں ایک قومی اقلیت کا درجہ حاصل ہے۔ مجھے لگا کہ عیسیٰ جابر بہت اوپری دل سے باتیں کر رہے ہیں موقع ملتے ہی میں نے آس پاس کے کچھ لوگوں سے ملاقات کی اور ان سے پوچھا کہ وہ اسرائیل میں کیسا محسوس کرتے ہیں؟ اس سوال پر ان کے دلوں کا درد ہونٹوں پر آ گیا۔ ابوغوش کے ان قدیم باشندوں میں سے ایک بزرگ نے کہا کہ اسرائیلی جتنے بھی دعویٰ کریں کہ یہاں رہنے والے مسلمانوں کے ساتھ وہ برابری کا سلوک کرتے ہیں چاہے وہ جتنے بھی حوالے دیں کہ یہاں اقلیتوں کے ساتھ مساوات اختیار کی جاتی ہے اس پر یقین مت کیجئے گا۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ ہماری ہی زمین ہے ہمارا ہی وطن ہے لیکن ہم اپنی ہی سرزمین پر تیسرے درجہ کے شہری بن گئے ہیں یہودی پہلے نمبر کے شہری ہیں، عیسائی دوسرے نمبر اور ہم تیسرے درجہ کے شہری ہیں۔ ہم کو اپنے مردے دفن کرنے تک میں بھی پریشان کیا جاتا ہے قبرستانوں کی دیکھ ریکھ اور انتظامات پر بھی پابندیاں لگا رکھیں ہیں اسرائیلی حکومت نے۔ انھوں نے کہا ادھر کہیں دنیا میں کوئی دہشت گردی کا واقعہ ہوتا ہے اور یہاں کی پولیس ہمارے گاؤں کے بچوں کو پوچھ تاچھ کے نام پر اٹھانا شروع کر دیتی ہے۔ گیارہ ستمبر کے حملے کی برسی ہوتی ہے تو ایک ہفتہ پہلے ہمارے محلوں میں پولیس کا گشت بڑھ جاتا ہے اور نوجوانوں پر سخت نگاہ رکھنی شروع کر دی جاتی ہے۔ ہم اپنے رشتے داروں اور عزیزوں سے ملنے فلسطین میں نہیں جاسکتے ان لوگوں نے سیکوریٹی کے نام پر ہر طرف اونچی اونچی دیواریں اٹھا رکھی ہیں۔ ہمارے بچوں کو تعلیم کے بہتر مواقع نہیں ملتے۔ ہم کو اپنے بچوں کو اونچی تعلیم دلوانے کے لئے ترکی جیسے ممالک میں بھیجنا پڑتا ہے۔ عیسیٰ جابر کے مکان کے آس پاس رہنے والے مسلمانوں کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا۔ ابھی دو گھنٹے قبل ہی اسرائیل کے ایک روحانی رہنما ربائی مائیکل نے

ہم کو یروشلم کی ایک ایسی تصویر دکھائی تھی جس میں اتحاد، مساوات، دوستی اور خلوص کے جھوٹے رنگ بھرے تھے۔ ابوغوش کے مسلمانوں سے بات کرتے ہی وہ سارے جھوٹے دعوے ہوا میں تحلیل ہو گئے اور مسلمانوں کا کرب ذہن کے قرطاس پر درد بھری داستان کی شکل میں تحریر ہو گیا۔کل تک جو اپنی زمین کے مالک تھے ان کو امریکہ اور برطانیہ کی سازش نے اپنے ہی ملک میں غلام بنا دیا اور جو کہیں ہزاروں میل دور رہتے تھے وہ یہاں صیہونیت کے نام پر آئے اور آقا بن گئے۔

ابوغوش میں اپنے میزبانوں سے رخصت ہونے کے بعد ہم لوگ تل ابیب جانے والے راستے کی طرف چل دئے۔ یہاں راستے میں ہم کو ایسی جگہہ روکا گیا جہاں ہر طرف زیتون کے پیڑ لگے تھے اور وہاں ایک جشن یکجہتی چل رہا تھا۔اسرائیل کی مختلف تنظیموں کی جانب سے چلنے والے اس جشن کا نام Sulkha تھا اردو میں جس کے معنی صلح ہوتے ہیں۔اس پروگرام میں مسلمان اور یہودی نوجوان امن کے نغمے گا رہے تھے اور مختلف قسم کے کھانے پکائے جا رہے تھے اور ثقافتی پروگرام چل رہا تھا۔اس پروگرام میں شریک ہونے کے بعد محسوس ہوا کہ اسرائیلی نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد جنگ و جدال کی پالیسیوں سے تنگ آ گئی ہے لیکن ان کے سیاست داں امن کے نام پر دنیا کو صرف دھوکہ دینے میں مصروف ہیں۔تین دن کے اس پروگرام میں بہت سے ایسے لوگ بھی شریک تھے جن کے گھر والے اسرائیلی یا فلسطینی حملوں میں مارے جا چکے ہیں۔کچھ ایسے نوجوان بھی تھے جو ہتھیار چھوڑ کر امن کی کوششوں میں تعاون کرنا چاہتے تھے۔یہ جشن اس بات کا غماز تھا کہ اسرائیلی قوم جنگ سے تھک چکی ہے اور اب اپنے نافہم آقاؤں سے گزارش کر رہی ہے کہ وہ بھی امن کی حقیقی کوششیں کریں۔





اس دلچسپ کیمپ میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وفد کو اسرائیل کی نائب وزیراعظم اور وزیر خارجہ زیپی لیونی سے ملاقات کے لئے تل ابیب لایا گیا۔ یہاں ایک سرکاری دفتر میں ان سے ملاقات رکھی گئی اس ملاقات کو پوری طرح سے خفیہ رکھا گیا تھا۔اسرائیل کے اخبار والوں کو یہاں نہ تو بلایا گیا تھا نہ ہی اس میٹنگ کو وزارت خارجہ کی بلڈنگ میں رکھا گیا۔ میٹنگ کے ہال میں کیمرے وغیرہ لے جانے کی ممانعت تھی ۔اسرائیل کی وزیر خارجہ Tzipi Livni نے ہندوستانی وفد کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا یہاں آنا بہت اہم ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ میٹنگ صرف ایک دن کی بات نہیں ہے بلکہ ہم برابر ملیں گے۔ لیونی نے کہا کہ اس خطہ میں جھگڑا فلسطین اور اسرائیل کے بیچ نہیں ہے بلکہ یہاں انتہا پسندی اور میانہ روی کے بیچ تصادم ہو رہا ہے۔(یعنی یہودی جو اپنے لباس اپنی وضع قطع اور اپنی قدامت پسندانہ ٹوپی کے بغیر گھر سے نکلتے ہی نہیں ہیں میانہ روی پر یقین رکھتے ہیں اور جو لوگ اپنے گھر کی بازیابی کی کوشش کر رہے ہیں وہ انتہا پسند ہیں)لیونی نے کہا کہ ہم دوسروں کے عقائد کے خلاف نہیں ہیں لیکن ایران سمیت کئی طاقتیں ہمارے وجود کو مٹانے کو درپے ہیں۔بعض لوگ دہشت گردی کو بڑھاوا دینے کے لئے مذہب کا استعمال کر رہے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی اپنی کمر میں بم باندھ کر شہید ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ ہمیں اس وقت عربوں اور مسلمانوں کی مدد درکار ہے تا کہ فلسطین اور اسرائیل کے بیچ چل رہا تصادم ختم ہو جائے۔لیونی کی چھوٹی سی تقریر کے بعد میں نے تین چار سوال اس کے سامنے رکھے۔اپنے پہلے سوال میں نے لیونی سے کہا کہ مسلمانوں میں عام طور پر یہ نظریہ قائم ہے کہ گریٹر اسرائیل کے نظریہ کے تحت صیہونیت ایک ایسے ملک کا قیام کرنا چاہتی ہے جس کی سرحدیں دریائے فرات سے دریائے نیل کے درمیان پھیلی ہوں۔اس پر لیونی نے کہا

کہ نہیں یہ سچ نہیں ہے ہم اپنی مملکت میں مزید توسیع نہیں کرنا چاہتے ہم تو بس امن کے خواہاں ہیں اور ہم فلسطینیوں کو ایک ہوم لینڈ دینا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنے دوسرے سوال میں لیونی سے کہا کہ دنیا بھر کے مسلمان یہ بھی سوچنے پر مجبور ہیں کہ اسرائیل کی حکومت محمود عباس کی حمایت کر کے فلسطینیوں کو تقسیم کر رہی ہے تا کہ وہ آپس میں لڑ کر کمزور ہو جائیں۔اس پر اسرائیل کی وزیر خارجہ نے کہا کہ فلسطین میں Moderates اور Extremists کے بیچ تصادم ہو رہا ہے۔فلسطینیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے درمیان سے انتہا پسندوں کو الگ کر دیں یعنی اسرائیل کے سب سے بڑے دشمن حماس سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ایک اور ہندوستانی صحافی نے اس دوران پوچھا کہ آپ کو کب تک امید ہے کہ فلسطینیوں کو ان کے حقوق حاصل ہو جائیں گے؟ اس پر لیونی نے کہا کہ ہمارے وزیر اعظم یہود اولمرٹ اور ابو مازن (محمود عباس ) کے بیچ گفت وشنید ایک اہم موڑ پر ہے اور جلد ہی کوئی نتیجہ نکلے گا۔۔۔پھر میں نے لیونی سے پوچھا کہ قدس یعنی یروشلم کو مسلمانوں کے حوالے کئے بغیر کیا مشرق وسطیٰ میں امن کا قیام ہوسکتا ہے؟ تو اس پر اسرائیلی وزیر خارجہ نے بہت ہی جل بھن کر جواب دیتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے لئے پہلا اہم ترین مقام مکہ مکرمہ ہے اور پھر مدینہ منورہ ان کے لئے مسجد اقصیٰ تیسرے نمبر پر آتی ہے لیکن ہمارے لئے تو یروشلم اولین اور محترم ترین شہر ہے۔ مسلمانوں کو ہمارے جذبات کا احترام کرنا چاہیے ( یعنی یروشلم سے دستبردار ہوجانا چاہیے ) لیونی نے اسرائیل میں ہونے والے فدائین حملوں پر تنقید کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ خیالی جنت کا دھوکہ دے کر لوگوں کو اپنی جان دینے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔





میں نے اپنے آخری سوال میں لیونی سے پوچھا کہ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے روزانہ نئی مشکلات کھڑی ہو رہی ہیں۔میرے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہی ان کے ایک معاون نے کان میں کچھ کہا اور انھوں نے جواب دئے بغیر ہی تنگئ وقت کی معذرت کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کی۔سوالات کے بعد ہندوستانی وفد میں شامل کچھ لوگوں نے لیونی کو ایک بہت ہی خوبصورت اور قیمتی شال اڑھائی لیکن اس شال اڑھائی کی رسم میں وفد کے ایک لیڈر کو لیونی سے ذرا دور رکھا گیا۔جس پر وہ صاحب اتنا چلائے اور اس قدر ناراض ہوئے کہ لگتا تھا کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے کسی پسندیدہ کام سے ان کو محروم کر دیا گیا ہو۔ان کو اس بات پر بھی غصہ تھا کہ انھیں لیونی کے سامنے ان کو نظر انداز کیا گیا اور لیونی کے سامنے امن قائم ہونے کی دعا کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔اسرائیلی سیکورٹی کے لوگ وفد کے ایک ممبر کو چیختے ہوئے حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر معاملے کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھے۔

لیونی سے ملاقات کے بعد ہندوستانی وفد کو ایک ہندوستانی ریسٹورنٹ 'اندرا' میں عشائیہ کے لئے لے جایا گیا لیکن ڈنر میں ابھی کافی وقت باقی تھا اس لئے ہم لوگ پاس کے ایک شاپنگ مال میں ٹہلنے کے لئے چلے گئے۔وہاں سیکورٹی کا بہت سخت انتظام تھا اس لئے ہم لوگوں کو تلاشی کے بعد ہی اندر جانے کا موقع ملا مگر شاپنگ مال میں مصنوعات واشیا اس قدر مہنگی تھیں کہ وہاں سے کچھ بھی خریدنا بے وقوفی ہوتا ہم لوگ لوٹ کر ریسٹورنٹ آ گئے۔یہاں ہندوستانی بریانی، کباب، پراٹھے، مچھلی اور ساگ سبزی کا انتظام تھا۔ان تمام پروگراموں میں شیخ عبدالعزیز بخاری بھی ہندوستانی وفد کے ساتھ موجود تھے۔ان سے ہندوستانی وفد نے یہودیوں کے یہاں گوشت کھانے کا مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ چوں کہ

یہودی بھی مسلمانوں کی طرح ہی جانوروں کو ذبح کرتے ہیں اور اس پر خدا کا نام بھی لیتے ہیں اس لئے ان کے یہاں گوشت کھایا جا سکتا ہے اور ذبیحہ کے اس طریقے کو کوشر Koshar کا نام دیا جاتا ہے۔

انڈیا کے ویج اور نان ویج فوڈ کا مزہ لینے کے بعد ہندوستانی وفد انڈیا فیسٹول کی تقریبات میں حصہ لینے کے لئے اسرائیل کے Eretz میوزیم کے آڈیٹوریم میں پہنچا۔ ایک ہفتہ تک چلنے والا یہ فیسٹول ہندوستان کی آزادی کے 60 سال پورے ہونے اور اسرائیل کے ساتھ ہندوستان کے سفارتی تعلقات قائم ہونے کی 15 ویں سالگرہ کے موقع پر شروع کیا گیا تھا۔ یہاں پر پہلے تو تقریریں ہوئیں اور اس کے بعد کویتا رائے چودھری نے رقص کیا۔ اس جشن میں مولانا افضال نظامی اور مولانا حفظ الرحمان میرٹھی شامل نہیں ہوئے اور دونوں نے کہا کہ اندر ناچ رنگ کی محفل ہے جس میں وہ نہیں جانا جب رات ڈھلنے لگی تو ہندوستانی وفد رقص کے دوران ہی محفل سے اٹھ کر چلا آیا کیوں کہ رات کافی ہو چکی تھی اور ہم لوگوں کو یروشلم واپس جانا تھا۔

ہوٹل میں واپس پہنچ کر میں یہی سوچتا رہا کہ اب تک جتنے اسرائیل لیڈروں سے ملاقات ہوئی سب نے دہشت گردی اور انتہا پسندی کا شکوہ کیا لیکن اپنے فرقے کے انتہا پسندوں کی کوئی بات نہیں کی حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہودیوں نے فلسطینی مسلمانوں کو پچھلے 60 برسوں سے دہشت کے سائے میں جینے پر مجبور کر رکھا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی انفرادی دہشت گردی پر مجبور ہے اور کوئی سرکاری دہشت گردی کا سہارا لے کر مظلوم فلسطینی مسلمانوں پر مشق ستم کر رہا ہے۔ مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ کوئی یہودی اس بات کا ذکر بھی کیوں نہیں کرتا کہ دنیا میں دہشت گردی کی ابتداء





یہودیوں نے ہی کی تھی۔

ہر اسرائیل سیاست داں اب دو قومی نظریہ کی بات کر رہا ہے جس کی مثال صرف اسی طرح دی جا سکتی ہے کہ اگر کوئی میرے گھر پر آ کر قبضہ کر لے اور طاقت کے بل پر مجھے زیر کر کے زور زور سے کہے کہ یہ تو وہی گھر ہے جس کا مجھ سے خدا نے وعدہ کیا تھا۔۔۔تو میں کیا کروں گا؟ جو چیز بھی میرے ہاتھ لگے گی اسی سے اس ظالم پر وار کروں گا۔ یہی فلسطینی مسلمانوں نے بھی کیا اور اپنے گھر، اپنی زمین اور اپنے وطن کی حفاظت کے لئے لگاتار جدوجہد کی اور جب وہ اپنے کچھ مسلمان بھائیوں کی مدد سے طاقتور ظالم کو کسی حد تک زیر کرنے میں کامیاب ہوئے تو اب غاصب ان سے کہہ رہا ہے کہ ہم تو امن چاہتے ہیں آؤ آپس میں بات کر کے گھر کو بانٹ لیں اور اگر تم گھر بانٹنے پر راضی نہ ہو تو تم انتہا پسند ہو؟

# مسجد اقصیٰ میں نماز جمعہ

آج جمعہ تھا اور ہم لوگوں کو مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنا تھی لیکن نماز سے قبل ہمارے پاس کافی وقت تھا۔اس لئے وفد کے میز بانوں نے نے طئے یہ کیا کہ وفد کے لوگوں کو پہلے ہولوکاسٹ میوزیم بھی لے جایا گیا۔اس میوزیم کے معاملے میں اسرائیلی عوام اور حکام بڑے جذباتی ہیں۔بالخصوص ایران کے وزیر اعظم جناب احمدی نژاد کی جانب سے Holocaust کی سچائی پر سوالیہ نشان لگائے جانے کے بعد اسرائیلی ہولوکاسٹ میوزیم کی تشہیر بڑے پیمانے پر کررہے ہیں۔اس میوزیم کا نام 'یادواشم' ہے۔اس میوزیم میں ہٹلر کے نازی سپاہیوں کے مظالم کا مبینہ طور پر شکار ہونے والے یہودیوں کے واقعات کو مختلف طور طریقوں سے دکھایا گیا ہے۔کہیں گیس کے چیمبر کی نقل بنائی گئی ہے تو کہیں قید خانوں کے اذیت ناک مناظر پیش کئے گئے ہیں۔اس کے علاوہ کئی جگہ ویڈیو فلمیں چلتی رہتی ہیں جن میں یہودیوں پر ہونے والے مظالم کی قدیم تصاویر دکھائی جاتی ہیں۔

ہم تینوں صحافی (شیخ منظور، ذیشان حیدر اور راقم الحروف) اس میوزیم کو دیکھنے نہیں گئے کیوں کہ ہم لوگوں نے سوچا تھا کہ کسی سائبر کیفے سے ای میل کر کے اپنے اخبار کے لئے خبر روانہ کریں ہمارا گائڈ ہم کو سائبر کیفے کی طرف لے کر چل دیا۔ہم لوگ مسلمان محلوں کی مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک سائبر کیفے میں پہنچ گئے۔اس سائبر کیفے تک پہنچنے کے لئے ہم لوگوں کو ایک زینہ طئے کر کے اوپر جانا پڑا۔یہاں بھی ایک فلسطینی





شہید کی تصویر آویزاں تھی اور سائبر کیفے کا مالک شائد اس شہید کا چھوٹا بھائی تھا۔ہم لوگوں کو اس نوجوان سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا کیوں کہ ہم سب کو اپنے اپنے ادارو ں کو خبر روانہ کرنے کی جلدی تھی۔ہم لوگوں نے ڈیڑھ دو گھنٹے سائبر کیفے میں بتائے اس دوران ہندوستانی وفد کے لوگ بھی واپس آگئے۔ ہندوستانی ڈیلی گیشن کے کچھ ممبر اس میوزیم کو دیکھ کر کسی حد تک متاثر دکھائی پڑے۔حالانکہ یہ میوزیم اپنے مظالم پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے۔مسلمانوں پر ہزار ظلم ڈھانے کے بعد ستر اسی سال پرانی تصویریں دکھا کر یہودی آج بھی خود کو مظلوم ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ہم لوگ جس سائبر کیفے میں تھے وہاں سے مسجد اقصیٰ ڈیڑھ دو کلومیٹر دور تھی۔مسجد تک ہم لوگوں کو پیدل ہی سفر کرنا تھا تپلی تپلی گلیوں میں نمازیوں کا ہجوم مسجد کی طرف رواں دواں تھا۔ہم لوگ بھی اسی بھیڑ کا حصہ بن گئے۔

یروشلم میں یہ بڑا روحانی منظر تھا۔ ہر طرف سے لوگ جوق در جوق مسجد اقصیٰ کی طرف جاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔مسلمانوں کی تمام دوکانیں بند تھیں۔مسجد اقصیٰ کی طرف جانے والی خاص گلی سے ملنے والی ہر گلی سے مسلمان جوق در جوق باہر نکل رہے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ دہلی کی جامع مسجد کے علاقہ میں مسلمان عید کی نماز ادا کرنے کے لئے جارہے ہوں۔ہم کو بتایا گیا تھا کہ اگر نماز سے آدھے گھنٹے قبل آپ مسجد میں نہ پہنچے تو مسجد کے الانوں میں آپ کو جگہ نہیں مل پائے گی۔ ہم لوگ آدھا گھنٹہ قبل ہی پہنچ گئے۔خواتین بھی بڑی تعداد میں یہاں نماز کے لئے موجود تھیں لیکن ان کی صفیں الگ تھیں۔ کچھ خواتین اس حصہ میں بھی نماز ادا کرنے کے لئے جمع تھیں جہاں آنحضرت ﷺ شب معراج تشریف لائے تھے۔نماز سے کافی پہلے ہی مسجد کے وسیع وعریض

صحن نمازیوں سے بھر چکے تھے۔

ہندوستانی ڈیلی گیشن کے ساتھ شیخ عبدالعزیز بخاری بھی مسجد اقصیٰ میں موجود تھے۔ ان ہی کی کوشش سے ڈیلی گیشن کے لوگوں کو اس حصہ میں نماز ادا کرنے کا موقع مل گیا جو مسجد کا سب سے قدیم حصہ ہے۔ اس حصہ کے لئے کہا جاتا ہے کہ پیغمبر حضرت ابراہیمؑ نے ( کعبہ کی تعمیر کے چھ سال بعد یروشلم میں ) اپنے ہاتھ سے اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے زمانے میں مسجد کے بالائی حصہ کو مرکزی شکل دے دی گئی ہے کیوں کہ قدیم مسجد نمازیوں کے لئے تنگ ہوگئی تھی۔ حضرت ابراہیم کے تعمیر کردہ قدیم دالانوں کے کئی ہزار سال پرانے آثار آج بھی موجود ہیں لیکن چھتوں کو مضبوط کرنے کے لئے کنکریٹ کے ستون اور دیواریں بنا کر پرانے حصہ کو کچھ برس قبل مستحکم بنایا گیا ہے۔ اب اس کو مسجد کے تہہ خانے کی سی شکل حاصل ہوگئی ہے، اس لئے کئی سیڑھیاں اتر کر اندر جانا پڑتا ہے۔ اسی حصہ میں اسلامی کتب کی ایک بہت ہی اچھی لائبریری بھی ہے۔

یہاں نماز پڑھانے کے لئے تین امام مقرر ہیں۔ ایک کے ذمہ مغرب وعشاء کی امامت ہے، دوسرے کو ظہر وعصر کی اور تیسرے امام کو صبح کی نماز اور جمعہ کی نماز کی امامت سونپی گئی ہے۔ جمعہ کی نماز شیخ ابو یوسف سنینہ نے پڑھائی۔ نماز سے قبل انھوں نے عربی میں جو خطبہ دیا وہ ہم لوگوں کی سمجھ سے باہر تھا، اس لئے بس خاموشی سے سنتے رہے لیکن خطبہ کے آخری حصہ میں ان کے کچھ الفاظ ایسے تھے جن پر ہم چونک پڑے۔ وہ سخت لہجے میں امریکہ اور اسرائیل کی پالیسیوں پر تنقید کر رہے تھے۔ انھوں نے حماس، حزب اللہ، شام اور ایران کا بھی نام لیا۔ لیکن میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا اس لئے تجسس بڑھ گیا۔





جمعہ کی نماز ختم ہونے کے بعد کچھ توقف سے عصر کی نماز کے لئے سب لوگ کھڑے ہوگئے اور عصر کی نماز باجماعت ادا کی گئی۔ نماز کے بعد میں نے کچھ نوجوانوں سے امام کا نام پوچھا اور ان کی تقریر کا مطلب معلوم کیا۔ ایک عرب نوجوان نے بتایا کہ امام صاحب مشرق وسطیٰ میں اسرائیل اور امریکہ کی پالیسیوں پر شدید نکتہ چینی کر رہے تھے اور ان اسلام دشمن طاقتوں کی چالوں کے خلاف مسلمانوں کو آگاہ کر رہے تھے۔ امام صاحب نے حزب اللہ، حماس، ایران اور شام کے خلاف چل رہی امریکی سازشوں کی مذمت کی اور عراق وافغانستان کے مسلمانوں کی فتحیابی کے لئے دعا بھی کی تھی۔ یہ باتیں سن کر میرے دل نے امام یوسف ابوسنینہ کی ہمت کو سلام کیا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ مسجد کے ہر دروازے پر اسرائیل کی مسلح افواج کے سپاہی موجود ہیں اس کے باوجود امام صاحب نے بے خوف وخطر سچ بات کہنے کی ہمت کی۔ میرے دل نے کہا کہ جب تک مسلمانوں میں ایسے جیالے اور حق پرست علمائے کرام موجود ہیں ہماری قوم طاغوتی طاقتوں سے مرعوب نہیں ہوسکتی۔

نماز تمام ہونے کے بعد مسجد اقصیٰ کے کئی گوشوں میں چھوٹے چھوٹے مکتب سج گئے جہاں ایک استاد کی نگرانی میں دس پندرہ بچے درس کلام پاک حاصل کرنے میں مصروف ہوگئے۔ میں مسجد کے دالانوں سے باہر نکلا اور صحن میں موجود بھیڑ میں گم ہوگیا تا کہ کچھ نوجوانوں سے وہ سوال پوچھ سکوں جن کا جواب جاننے کے لئے میں ہندوستان سے یہاں تک آیا ہوں۔ میں نے ایک بلند قامت نوجوان کو اپنے پاس بلایا اور اس کہا کہ کیا تم کو انگریزی آتی ہے؟ تو اس نے میرا جواب دیئے بغیر ایک دوسرے لڑکے کو آواز دی۔ اس جوان نے آتے ہی مجھ سے پوچھا۔۔ پاکستانی؟ میں نے کہا نہیں۔۔۔ ہندی۔۔۔

اس نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ اسرائیلی حکام حزب اللہ کو بہت برا کہتے ہیں۔ تمہارا ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس سوال پر ابوحمزہ نام کے اس نوجوان نے تڑپ کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور انگریزی میں کہا ''حزب اللہ ہمارے دل کی آواز ہے۔۔۔ وہ جیالے مرد ہیں۔۔۔ انھوں نے مسلمانوں کا سر اونچا کیا ہے۔'' میں نے حماس کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے مایوسی بھرے لہجے میں کہا کہ الفتح اور حماس کی لڑائی افسوسناک ہے۔ امریکہ ان کو لڑوا رہا ہے۔ محمد نام کے دوسرے نوجوان سے بھی میں نے پہلے حزب اللہ کے بارے میں سوال کیا تو جواب میں گھونسے کے انداز میں ہاتھ بلند کرتے ہوئے اس نے کہا کہ حزب اللہ شیروں کا قبیلہ ہے۔۔۔ کیا ہوا۔ اگر وہ شیعہ ہیں۔۔۔ کس کو معلوم کون جنت میں جائے گا کون جہنم میں۔۔ اس کا فیصلہ تو اللہ کرے گا۔۔۔ لیکن آج تو انھوں نے ہم مسلمانوں کو بتا دیا ہے کہ صیہونی طاقتوں کے سامنے سر اٹھا کر کیسے کھڑا ہوا جاتا ہے۔ حماس کے بارے میں پوچھے گئے سوال پر محمد نے کہا کہ حماس کو ہتھیار چھوڑ کر اپنے بھائیوں کو گلے لگانا چاہیئے۔۔۔ دونوں گروہ مل کر ہی ایک مضبوط فلسطین کی تعمیر میں موثر کردار نبھا سکتے ہیں۔ مجھ کو نوجوانوں سے بات کرتے دیکھ کر کئی نمازی میرے چاروں طرف جمع ہو کر غور سے میری باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس بھیڑ میں موجود ایک نوجوان سے میں نے پوچھا کہ مسجد اقصیٰ کی فلاح کے لئے یہودی کیا کر رہے ہیں؟ اس پر اس نوجوان نے میرا ہاتھ پکڑا اور مسجد کے اندر پھر سے لے گیا اور وہاں کے بڑے دالان میں کچھ شوکیس رکھے تھے جن میں راکٹ، میزائل اور گولیوں کے خالی کھوکھے بھرے تھے اس نوجوان نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ ہے مسجد کی فلاح۔۔۔ انھوں نے مسجد پر یہ





سب برسایا ہے۔۔۔ مسجد کی دیواروں پر بنے گولیوں کے نشان دکھاتے ہوئے نوجوان نے کہا کہ یہ ہے اسرائیلی طرز کی نگہداشت۔۔۔

یروشلم کے ان باشندوں سے بات کرنے کے بعد میں نے ذیشان حیدر کے ساتھ معراج رسولؐ والے حصہ کا رخ کیا اور جوتے اتار کر ہم دونوں اندر پہنچے تو وہاں بڑا روح پرور منظر تھا۔ سینکڑوں خواتین اور بچے قرآن خوانی میں محو تھے۔ کچھ مرد حضرات اس غار میں نوافل ادا کر رہے تھے جہاں آنحضورؐ نے شب معراج نماز ادا کی تھی۔ ذیشان اور میں نے وہاں شکرانے کی دو رکعت نماز پڑھنے کی سعادت حاصل کی اور باہر نکلے تو سوچنے لگے کہ ہندوستانی ڈیلی گیشن سے جدا ہونے کے بعد ہم ان کو ڈھونڈیں گے کہاں؟ طئے شدہ پروگرام کے مطابق نماز کے بعد شیخ عبدالعزیز بخاری کے گھر پر لنچ کا اہتمام تھا اور یروشلم کے اوقاف کے مہتمم شیخ عزام الخطیب التمیمی سے بھی ہم لوگوں کو ملاقات کرنا تھی لیکن مجھے شیخ عزیز کا گھر نہیں معلوم تھا مگر اللہ کے کرم سے زیادہ پریشانی اٹھانا نہیں پڑی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے ہندوستانی ڈیلی گیشن کے لوگ ایک گوشے میں نظر آ گئے۔ کچھ قدم چلنے کے بعد مسجد کے بائیں برآمدے میں ہم لوگوں کو مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی قبر نظر آئی۔ اس کے بارے میں شیخ عبدالعزیز نے بتایا کہ ان کے والد نے مولانا محمد علی جوہرؔ کے جسد خاکی کو برطانیہ سے لائے جانے کے بعد یہاں اس حجرے میں سپرد خاک کیا تھا۔ واضح رہے کہ خلافت تحریک کے بانی مولانا محمد علی جوہرؔ نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کو ایک ایسے ملک کی مٹی میں دفن نہ کیا جائے جو انگریزوں کی غلامی میں گرفتار ہے۔ اسی لئے جب ان کا انتقال لندن مین ہوا تو ان کے جسد خاکی کو لندن سے بیت المقدس پہنچایا گیا۔ لیکن مولانا مرحوم کو کہاں علم تھا کہ وہ ارض مقدسہ بھی یہودیوں کے قبضہ میں

جانے والی ہے جہاں ان کو دفن کیا جار ہا ہے۔مجاہد آزادی مولانا محمد علی جوہرؔ کی قبر پر فاتحہ
پڑھنے کے بعد ہم لوگ شیخ عزیز بخاری کے مکان پر گئے جو مسجد اقصیٰ سے تھوڑی ہی دور
پر واقع ہے۔اس علاقہ کے ایک گھر سے دوسرے گھر کی چھت ملی ہوئی تھی اور پتلی پتلی
گلیوں کو آپس میں جوڑنے کے لئے چھتے بنے ہوئے تھے۔ مجھے یہ مکانات دیکھ کر
پرانے لکھنوء کے گھروں کی بہت یاد آئی وہاں بھی پڑوسی کے مکان میں جانے کے لئے
چھتے بنائے جاتے تھے تا کہ ایک دوسرے کے گھر میں ہونے والی تقریبات میں عورتیں
اندر ہی اندر بغیر برقع پہنے جاسکیں۔

شیخ عبدالعزیز کے گھر پر کھانے کی دعوت میں یروشلم کے اوقاف کے مہتمم شیخ عزام
الخطیب التمیمیا ور کچھ مقامی حضرات بھی مدعو تھے۔ یہاں خالص عربی کھانوں سے ہم
لوگوں کی تواضع کی گئی۔ بڑی بڑی تندوری روٹیاں، آلو گوشت کا سالن اور خوش مزہ پلاؤ
سے ہم لوگوں کی خاطر داری کی گئی۔دعوت ختم ہونے کے بعد مسجد اقصیٰ کے موذن فراس
القزاز نے مسحور کن انداز میں تلاوت کلام پاک کی۔اس کے بعد ایک مقامی باشندے
عبدالکریم الزربا نے لحن داؤدی میں نعت رسولؐ پیش کی۔زبان نہ سمجھنے کے باوجود ان کی
نعت خوانی نے دل کو مسحور کر کے رکھ دیا۔

نعت خوانی کے بعد ہندوستان سے آئے ہوئے تینوں اخباری نمائندوں (راقم
الحروف، شیخ منظور، یو این آئی اور ذیشان حیدر، پی ٹی آئی) نے قدس شریف کے اوقاف
کے مہتمم شیخ عزام الخطیب التمیمی سے مسجد اقصیٰ کی دیکھ بھال کے بارے میں مختلف
سوالات کئے۔شیخ نے بتایا کہ مسجد اقصیٰ اور اس سے ملحق اوقاف کے لئے اردن کی شاہی
حکومت ہر سال 50 لاکھ اردنی ریال یہاں بھیجتی ہے لیکن اسرائیل کی حکومت اس کی تعمیر





وتوسیع میں مسلسل اڑنگے لگاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو طاقت کے بل پر اس مسجد کی
مرمت سے روکا جاتا ہے۔شائد اسرائیلی حکومت کی مرضی یہ ہے کہ مسجد اپنے آپ ہی گر
جائے۔مرمت کے لئے عمارتی سامان لانے والی گاڑیوں کو اسرائیلی سپاہی مسجد تک آنے
نہیں دیتے۔ یہاں تک کہ یونیسکو نے بھی مسجد اقصیٰ کو یروشلم کے سب سے اہم آثار
قدیمہ کا درجہ دیا ہے لیکن یونیسکو کے اصرار کے باوجود اسرائیلی حکومت ٹس سے مس نہیں
ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ اسرائیل کی حکومت اپنی من مانی کرتی رہتی ہے۔مغربی
دروازے کے باہر اس نے مراقش گیٹ کو چوڑا کیا تا کہ دیوار گریہ کے لئے مزید جگہ نکالی
جا سکے۔انھوں نے کہا کہ ہم کسی مذہب کے خلاف نہیں ہیں لیکن جو لوگ مسجد اقصیٰ کو
منہدم کرنا چاہتے ہیں ہم ان کے ساتھ امن کی بات کیسے کر سکتے ہیں؟ شیخ تمیمی سے جب
یہ پوچھا گیا کہ اردن سے جو امداد آتی ہے اس کا مصرف کیا ہوتا ہے تو انھوں نے کہا کہ
وقف کے چھ سو ملازمین ہیں۔ ان کی تنخواہیں اسی فنڈ سے دی جاتی ہیں۔لائبریری،
اسکول اور دیگر فلاحی ادارے بھی اسی رقم سے چلائے جاتے ہیں۔انھوں نے کہا کہ
اوقاف سے کچھ آمدنی بھی ہوتی ہے لیکن یہ بہت کم ہے۔انھوں نے کہا کہ ہم آمدنی کی فکر
کرتے بھی نہیں کیوں کہ اوقاف پیسہ کمانے کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ عوامی فلاح و بہبود کے
لئے قائم کئے گئے ہیں اس لئے ہم بس یہی بات اپنے پیش نظر رکھتے ہیں کہ اوقاف کا
فلاحی مقصد پورا ہو رہا ہے کہ نہیں۔

اس گفتگو کے بعد ہم لوگ پرانے یروشلم کے گلی کوچوں میں گھومنے نکلے۔اس شہر میں
تین مذہبوں کی اہم ترین زیارت گاہیں ہیں۔ہم شیخ کے گھر سے تھوڑی ہی دور چلے تھے
کہ وہ مقام آگیا جہاں سے حضرت عیسیٰ کو صلیب اٹھا کر چلنے پر مجبور کیا گیا تھا۔

(مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق وہ شخص حضرت عیسیٰؑ کا حواری تھا جس کو صلیب کی جانب لے جایا جا رہا تھا اور خود حضرت عیسیٰؑ کو اللہ نے مصلوب ہونے سے بچا لیا تھا۔) اس مقام کو پہلی منزل کا نام دیا جاتا ہے۔ اونچائی کی طرف بڑھتی ہوئی اسی طرح کی بارہ یا تیرہ منزلیں راستے میں پڑیں (جہاں پر اب چھوٹے چھوٹے چرچ بنے ہیں) جہاں جہاں مصلوب ہونے والا شخص گرا تھا وہاں پر خصوصی تصاویر بنائی گئی ہیں۔ آخر میں وہ چرچ نظر آتا ہے جہاں حضرت مسیح (کے ہمشکل) کو مصلوب کیا گیا تھا۔ وہاں ایک بڑا سا (ٹب نما) پتھر بھی رکھا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسی پر حضرت مسیح (کے ہمشکل) کو مصلوب کئے جانے کے بعد غسل دیا گیا تھا۔ ان راستوں پر دنیا کے مختلف گوشوں سے آئے ہوئے عیسائی زائرین بھی سینکڑوں کی تعداد میں نظر آئے۔ عیسائی زائرین کے یہ گروہ انجیل کے کلمات کو گاتے ہوئے چل رہے تھے۔ کئی راہب اور راہبائیں اشک افشانی بھی کر رہی تھیں۔

پرانے یروشلم کی گلیوں میں چلتے ہوئے ہم کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے چاندنی چوک کے کٹروں سے گزر رہے ہوں۔ کہیں کباب سجے تھے تو کہیں گرم گرم روٹیاں سینکی جا رہی تھیں۔ عطریات کی دوکانوں کے ساتھ ساتھ یہاں عبا اور اسکارف بیچنے والوں کی دوکانیں بھی تھیں ۔ ریسٹورنٹ میں گپ بازی کرنے والے لوگ بھی بیٹھے تھے۔ یہ دوکانیں نماز جمعہ کے بعد کھلی تھیں لیکن ابھی بھی کافی دوکانیں بند تھیں۔ میں نے اور ذیشان حیدر (صحافی پی ٹی آئی) نے کچھ سامان خریدنے کے لئے کرنسی تبدیل کرنا مناسب سمجھا۔ یہاں دو قسم کی کرنسی چلتی ہے یعنی اردنی ریال اور اسرائیل کا سکہ شیکل۔ جب تک ہم کرنسی تبدیل کرتے کچھ چھوٹے بچے ہمارے ارد گرد جمع ہو گئے ان میں سے کچھ سائیکل پر سوار تھے۔ میں نے ان سے پوچھا تم





مسلمان ہو؟ انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یاسر اور احمد نام کے دو بچوں سے میں نے پوچھا حزب اللہ کو تم جانتے ہو؟ یاسر نے کہا Yes are our Heroes They.... اس طرح یہ بات واضح ہو گئی کہ اسرائیل اور امریکہ کی طرف سے مسلمانوں کو لڑوانے کی ہزاروں کوششوں کے باوجود تمام دنیا کے مسلمان شیعہ اور سنی کے حصار سے باہر آنے میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

پرانے یروشلم سے گزرتے وقت ایک بہت ہی کربناک حقیقت بھی دکھائی دیتی ہے۔ بہت سی دوکانوں پر ایسے جوانوں کی تصویریں لگی ہوئی نظر آتی ہے جو اسرائیل کی فوج کے ہاتھوں شہید ہوئے ہیں۔

پرانے یروشلم کی فصیل سے تھوڑا آگے چل کر ہم لوگ پیغمبر حضرت داؤد کی قبر پر گئے یہاں بھی یہودی، عیسائی اور مسلمان برابر سے آتے ہیں۔ حضرت داؤد کا مزار نیچے تہہ خانے میں ہے جس میں داخل ہونے کی کسی کو اجازت نہیں ہے۔ مزار کی باہری دیواروں پر بہت سی شمعیں روشن تھیں۔ کچھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہم لوگ ایک کمرے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ کمرہ کئی سو سال پرانی مسجد ہے جہاں محراب بھی بنی تھی اور قرآنی آیات بھی لکھی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ہم لوگ ہوٹل لوٹ آئے۔

# یہودی سباتھ

یہودیوں کے لئے شنبہ (ہفتہ) تعطیل کا دن ہوتا ہے اور چوں کہ ان کا دن سورج ڈوبنے کے بعد شروع ہو جاتا ہے اس لئے یہودی لوگ جمعہ کو سورج غروب ہونے کے بعد اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیتے ہیں اور چوبیس گھنٹے عبادت میں مصروف رہتے ہیں ۔ یہ وقفہ شروع ہونے کے وقت سب اہل خانہ ایک ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کرتے ہیں اور خصوصی ڈنر کھاتے ہیں جس کو Sabbath کہا جاتا ہے۔ اس ڈنر میں کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد توریت سے کچھ خاص دعائیں پڑھی جاتی ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی اس لئے تعریف و توصیف کی جاتی ہے کہ اس نے انسانوں کو انگور جیسی نعمت سے نوازا جس سے بہترین شراب کشید کی جاتی ہے۔ ہم لوگ بھی ربائی ڈیوڈ روزن کے گھر پر سباتھ کی دعوت میں مدعو کئے گئے تھے۔ ہم لوگ سورج غروب ہونے کے بعد ڈیوڈ روزن کے گھر پہنچ گئے۔

ڈیوڈ روزن کا گھر بے حد خوبصورت اور دلکش تھا وہاں سے مسجد اقصیٰ کا نظارہ بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ شعبان کا مہینہ تھا اور اس دن چاند کی تین تاریخ تھی۔ فلسطینی مسلمانوں کی بستیوں میں کئی جگہ آتش بازی کی جا رہی تھی۔ اس آتش بازی کے بارے میں ڈیوڈ روزن نے بتایا کہ ان دنوں مسلمانوں کے یہاں شادیاں بڑے پیمانے پر ہوتی ہیں اسی لئے یہ آتش بازی چھوڑی جا رہی ہے۔ ڈیوڈ روزن کے گھر سے بہت دور دریائے اردن کے اس پار چھوٹی چھوٹی روشنیاں بھی نظر آ رہی تھیں میں نے جب ان کے بارے میں دریافت کیا تو ڈیوڈ روزن نے بتایا کہ یہ اردن کا شہر عمان دکھائی دے رہا ہے۔ ڈیوڈ





روزن کے گھر میں ایک بڑی دوربین رکھی تھی جب اس کے ذریعہ دیکھا تو عمان کی کئی مساھد کے مینار بھی صاف صاف نظر آنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ کھانا شروع ہوا۔ ربائی ڈیوڈ روزن کے گھر پر چوں کہ ایک مسلم ڈیلی گیشن کو Sabbath کی دعوت پر بلایا گیا تھا اس لئے مسلمانوں کے جذبات کے احترام میں شراب کی جگہ انگور کا جوس سامنے رکھا گیا۔

اتفاق سے اس دن وفد میں شامل ایک بزرگ ممبر کو بدہضمی کی شکایت ہوگئی اور انھیں دست آنا شروع ہو گئے۔ پھر بھی ڈیوڈ روزن کے گھر چلے گئے اور کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ جب کھانا شروع ہوا تو میزبان نے ان سے بھی کھانے کے لئے کہا اس پر انھوں نے کہا کہ میرا تو روزہ ہے۔ یہودی ربّائی حیرت سے ان کا منھ تکنے لگا اور اس نے کہا کہ مسلمان تو دن میں روزہ رکھتے ہیں اب تو شام ہو چکی ہے؟ اس پر موصوف نے کہا کہ میں پچھلے چالیس برس سے جمعہ کی شب میں شام 6 بجے سے صبح 6 بجے تک روزہ رکھتا ہوں۔ وفد کے ممبروں کو اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا اور ہنستے ہنستے پیٹ میں درد ہوا جا رہا تھا۔

یہودیوں کے یہاں ہفتہ کے روز دنیاوی کام کاج کرنے کی ممانعت ہے۔ یہاں تک کہ ان کی کچھ کالونیاں ایسی بھی ہیں جہاں اس دوران ٹیلی ویژن، ریڈیو، موسیقی سننے کی ممانعت ہے یہاں تک کہ نقل و حمل کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اگر اس خصوصی ڈنر کے دوران قدامت پسند یہودیوں کی کالونی سے کوئی بس وغیرہ گزرے تو یہ لوگ اس پر پتھراؤ کر دیتے ہیں۔

# مغربی کنارے کا سفر

ہفتہ کا دن ہم لوگوں کو مغربی کنارے کی طرف لے جانے کے لئے مخصوص تھا۔ ہم بے چینی سے رملہ کی طرف جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ نو بجے سب لوگوں کو ایک بس میں سوار کیا گیا لیکن آج وہ اسرائیلی بس نہیں آئی جس سے ہندوستانی ڈیلی گیشن روز گھومنے جاتا تھا۔ بلکہ ایک فلسطینی کی بس آئی تھی جس پر جلی حروف میں 'القدس' تحریر تھا۔ ہم لوگوں کو بتا دیا گیا تھا کہ آج شیخ عبدالعزیز بخاری ہمارے ساتھ نہیں ہوں گے اور ہمارا گائڈ سولومن بھی صرف فلسطین کی سرحدی چوکی تک جائے گا۔ اس بس میں سوار ہونے کے بعد ہمارے تعجب کی انتہا نہیں رہی کہ جب ہم نے اپنی بس میں عران لرمین کو بھی موجود پایا۔ پروگرام کے مطابق ان کو شام پانچ بجے آنا تھا مگر یہ حضرت ہم کو فلسطین دکھانے سے پہلے اپنی مظلومی کی داستان سنانا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے ایک گائڈ کا رول اختیار کیا۔ (حالانکہ مجھے یقین تھا کہ ہمارا گائڈ رابنسن سولومن بھی اسرائیلی خفیہ سروسز کا ہی ایجنٹ تھا کیوں کہ وہ جہاں اپنا آئی ڈی کارڈ دکھاتا تھا وہاں پولس والے یا سیکوریٹی آفیسر فوراً راستہ دے دیتے تھے۔) کچھ دیر چلنے کے بعد ہماری بس ایک پہاڑی پر پہنچی جہاں سے پورا یروشلم نظر آ رہا تھا اور دور دریائے اردن کے اس پار اردن کی راجدھانی عمان کی مساجد کے مینار بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دوربین سے یہ اور بھی زیادہ صاف نظر آتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس پہاڑی پر ہم ایک شیطان کے ساتھ کھڑے تھے اس پہاڑی کا نام تھا Hill of the evil Council یعنی شیطان کے مشورے والی چوٹی ہے۔ حسن اتفاق سے اسی چوٹی پر اقوام متحدہ کا ایک دفتر





قائم ہے اور اسی چوٹی پر کسی زمانے میں انگریزوں کا ہائی کمیشن تھا۔ اس چوٹی پر کھڑے ہو کر ہم ایسٹ اور ویسٹ یروشلم کی آبادیاں دیکھ سکتے تھے۔ عران لرمین کا کہنا تھا کہ یروشلم میں یہودی ہمیشہ سے بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ یہ ایک تاریخی سچ بھی تھا کیوں کہ مسلمانوں نے یہودیوں پر یہاں کبھی ظلم وستم نہیں کیا اور ان کو پوری مذہبی آزادی کے ساتھ یروشلم میں آنے جانے اور رہنے کی آزادی دی لیکن یہ بھی ایک کڑوا سچ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں سے یہودی ایک سازش کے تحت یہاں بیسویں صدی کے اوائل میں یکجا ہونا شروع ہوئے اور انھوں نے اتنی چالاکی سے یہ کام شروع کیا کہ خلافت عثمانیہ بھی اس سے بے خبر رہی۔ جب مسلمان جاگے تو بہت دیر ہو چکی تھی یہاں تک کہ 1948 تک مغربی یروشلم میں یہودی اپنی اکثریت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ 1967 سے پہلے تک مشرقی یروشلم میں کوئی یہودی نہیں تھا لیکن عرب اسرائیل لڑائی کے بعد انھوں نے یروشلم کے مسلمانوں کو بزور طاقت بے گھر کر کے اور ان کی زمینیں چھین کر نئے کالونیاں بنا دیں۔ اب مشرقی یروشلم میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار یہودی رہتے ہیں جن کے رہنے کے لئے 59 ہزار مکانات بنائے گئے ہیں ساتھ ہی کئی فلسطینی بستیوں کو گرا کر ان کو گرین بیلٹ کا نام دے دیا گیا ہے اور وہاں شجر کاری کر دی گئی ہے۔ اس کے برعکس مشرقی یروشلم میں مسلمانوں کے صرف 32 ہزار گھر ہیں جن میں تقریباً دولاکھ اسی ہزار مسلمان اس طرح زندگی گزارتے ہیں کہ ایک ایک کمرے میں پانچ سے آٹھ نفوس رہنے پر مجبور ہیں۔

اس پہاڑی سے ذرا آگے بڑھ کر عران لرمین نے ہم لوگوں کو فلسطینی اتھارٹی اور اسرائیل کو الگ کرنے والی دیوار دکھائی۔ جہاں جہاں آبادی ہے وہاں وہاں دیوار ہے

جہاں ویرانہ ہے وہاں خار دار تار لگائے گئے ہیں جن میں بجلی کا کرنٹ دوڑتا ہے۔عران لرمین نے بتایا کہ اس دیوار کو تعمیر کرنے کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ اسرائیلی شہریوں کو فلسطینیوں کی جانب سے ہونے والی فائرنگ سے بچایا جاسکے۔اس نے ہم کو بتایا کہ دوسری انتفاضہ تحریک ایک پروپیگنڈہ کے سوا کچھ نہیں تھی۔ یہ اسرائیلیوں پر حملہ کرنے کا بہانہ تھا۔ہم نے اس دیوار کے ذریعہ اسرائیلی شہریوں پر ہونے والے حملوں کو روکنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔لرمین نے کہا کہ اس کے علاوہ ہم نے جامہ تلاشی کے ذریعہ خودکش بمباروں کو روکنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور ہمارے مخبروں نے بھی اس سلسلے میں ہماری بہت مدد کی ہے۔بیت الجلاء نام کے اس گاؤں میں اسرائیل نے 1970 میں یہودیوں کو (جبری طور پر) بسایا تھا۔اسرائیلیوں کے مطابق اس کالونی پر فلسطینیوں کی جانب سے فائرنگ ہوتی رہتی تھی، لیکن فلسطینیوں کا کہنا ہے کہ اس علاقہ میں رہنے والے اسرائیلی مسلح ہوتے ہیں اور وہ ذرا ذرا سی غلطی پر فلسطینی نوجوانوں کو گولی ماردینے میں ذرا سی جھجک محسوس نہیں کرتے جو کشیدگی کی اصل وجہ ہے۔اس موقع پر پی ٹی آئی کے صحافی ذیشان حیدر نے عران لرمین سے پوچھا کہ انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس نے اسرائیل سے کہا تھا کہ وہ اس دیوار کو منہدم کرے۔۔۔اسرائیل نے اس کا حکم کیوں نہیں مانا؟ اس پر لر مین نے انتہائی بے حیائی سے کہا کہ وہ ICJ کی رائے تھی اور یہ ہمارا حق ہے کہ ہم اسرائیلی شہریوں کی زندگی کی حفاظت کریں۔اس نے یہ بھی کہا کہ انصاف کے اس بین الاقوامی ادارے نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ اسرائیل 1967 کی سرحدوں میں واپس جائے لیکن ہم نے اس کو بھی اسرائیل کے وسیع تر مفاد میں نامنظور کر دیا۔کیوں کہ پانچ لاکھ یہودیوں کو مقبوضہ علاقوں سے منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔اس نے یہ بھی کہا کہ اسرائیل





کی پارلیمنٹ کے 120 میں سے 9 ممبر اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دریائے اردن سے تل ابیب تک کا سارا علاقہ اسرائیل کا ہے یعنی فلسطین کا کوئی وجود نہیں ہونا چاہئے۔

بیت الجلاء سے ہم فلسطین کے لئے روانہ ہوئے تو عران لرمین راستے میں اتر گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہماری بس رملہ کی سرحد پر پہنچی وہاں ضروری کاغذات دکھانے کے بعد اسرائیلی فوج نے ہم کو آگے جانے کی اجازت دی یہاں پر ہمارا گائڈ سالومن بھی اتر گیا۔فلسطینی اتھارٹی کی سرحد میں داخل ہوتے ہی ہندوستانی سفارت خانے کی ایک کار سے ایک سردار جی اور ایک دوسرے افسر نمودار ہوئے اور ہم سب سے ہاتھ ملانے کے بعد وہ اپنی کار میں سوار ہو کر ہماری بس کی رہنمائی کرنے لگے۔رملہ میں داخل ہوتے ہی ایک خاص فرق یہ نظر آیا کہ یہاں اسرائیل جیسی زندگی کہیں نہیں تھی، دکانوں پر عبرانی کے بجائے عربی میں سائن بورڈ لگے تھے۔سڑکوں پر بھیڑ بھاڑ بالکل نہیں تھی۔جگہ جگہ فلسطینی اتھارٹی کی مسلح پولیس کے جوان بھی نظر آرہے تھے۔سڑکوں پر عورتیں بالکل نہیں تھیں اور اگر ایک آدھ نظر آ بھی رہی تھی تو وہ حجاب میں تھی۔

تھوڑی دیر میں ہم رملہ میں ہندوستانی سفارت خانے کے نمائندے کے دفتر میں پہنچ گئے۔یہاں ہندوستانی سفارت خانے کے نمائندے جناب ذکر الرحمان نے ہم لوگوں کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ان کے دفتر میں فلسطینی اتھارٹی کے نائب وزیر خارجہ کے ساتھ کئی لوگ آئے ہوئے تھے۔اس کے علاوہ فلسطینی عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے والے کئی رضا کار اداروں کے کارکن بھی موجود تھے۔سب سے پہلے ہم لوگوں کو ایک فلسطینی NGO کے نمائندوں سے متعارف کروایا گیا۔یہ تنظیم اسرائیل کی جانب سے اٹھائی جانے والی دیوار کو نسلی امتیاز کی علامت مان کر اس کی مخالفت کر رہی ہے۔

## The Grassroots Palestinian Anti-Apartheid Wall Campaign

نام کی اس تنظیم کے ایک اہم ترین ممبر جمال جمعۃ نے ہم لوگوں کو سلائڈ شو کے ذریعہ وہ
مظالم دکھائے جن کو دیکھ کر پتھر صفت انسان کی آنکھ سے بھی آنسو نکل پڑیں۔ بچوں اور
عورتوں کی لاشیں، تباہ شدہ مکانات، جلے ہوئے گھر، اجڑی ہوئی منڈیاں، برباد دکانیں
اور تباہ شدہ فصلیں۔ سب صہیونیت کا تحفہ۔ اس صہیونیت کا تحفہ جو جگہ جگہ امن کا ڈھول پیٹ
رہی ہے۔ جھوٹ موٹ کے امن کا ناٹک کر رہی ہے تا کہ اپنے توسیع پسندانہ منصوبوں کو
پایہ تکمیل تک پہنچا سکے اور فلسطینیوں کی نسل کشی کا کام پورا کر سکے۔ اس کے بعد جمال جمعۃ
نے ہم کو اس دیوار کے بارے میں بتایا جو نسل پرست اسرائیلی سرکار کی جانب سے فلسطینی
علاقوں میں اٹھائی جا رہی ہے۔ جمال جمعۃ نے بتایا کہ سات سو کلومیٹر لمبی یہ دیوار نسلی امتیاز
کی علامت ہے اس دیوار کے ذریعہ اسرائیل کی سرکار فلسطینیوں کی زندگی دوبھر کر رہی
ہے۔ اس دیوار کے ذریعہ فلسطینی خاندانوں کے بیچ کی دوریاں بڑھائی جا رہی ہیں ہم کسی
زمانے میں جہاں دس منٹ میں پہنچ جاتے تھے آج ہم وہاں ڈیڑھ سے دو گھنٹے میں پہنچتے
ہیں۔ رملہ سے یروشلم پہنچنے میں کسی زمانے میں دس سے پندرہ منٹ لگتے تھے لیکن اب ہم
ڈیڑھ گھنٹے میں یروشلم پہنچتے ہیں۔ اس دیوار کے بارے میں اگر قارئین تفصیل سے جاننا
چاہتے ہیں تو وہ جمال جمعۃ کو اس پتے jamal@stopthewall.org پر ای میل
کر کے مزید معلومات حاصل کر سکتے ہیں، ساتھ ہی اپنے فلسطینی بھائیوں کی آواز میں آواز
بھی ملا سکتے ہیں اور ان سے اظہار ہمدردی بھی کر سکتے ہیں۔

لنچ کی میز پر فلسطینی نیشنل اتھارٹی کی وزارت خارجہ میں نائب وزیر کے عہدے پر





فائز ڈاکٹر احمد صبوح سے بات چیت کرنے کا موقع ہم صحافیوں کو ملا (پتہ نہیں ان سے
ڈیلی گیشن کے لوگوں نے کیا بات کی تھی کیوں کہ ہم لوگ اس وقت وفد سے الگ جمال
جمعۃ سے بات کر رہے تھے) انھوں نے ہم صحافیوں سے کافی دیر بات کی اور مختلف
سوالوں کے جوابات دئے۔ انھوں نے کہا کہ اسرائیل کی اپنی کوئی پالیسی نہیں ہے۔ وہ تو
بس امریکہ کے پیچھے چلتا ہے۔ اسرائیل ہمارے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرتا ہے کہ جیسے
ہم خطہ کے قدیم باشندے نہیں بلکہ غیر ملکی لوگ ہیں۔ اسرائیل نے ہمارے ساتھ کئے
گئے وعدے پورے نہیں کئے، اس لئے حماس کی طرف لوگوں کا جھکاؤ ہو گیا۔ انھوں نے
محمود عباس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا اس لئے ہم کمزور ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم
حماس کے خلاف نہیں ہیں۔ حماس کو ایک سیاسی پارٹی کا حق ملنا چاہئے ہم اس کی سیاسی
حیثیت کے قائل ہیں لیکن حماس کو ہم طاقت کے بل پر صدارت کی کرسی پر قبضہ نہیں کرنے
دیں گے۔ حماس نے اچھے نظم و نسق اور بدعنوانی سے پاک انتظامیہ کی بنیاد پر لوگوں میں
اپنی جگہ بنائی ہے۔ انھوں نے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہم اسرائیل کی
غلط حرکتوں کی وجہ سے الیکشن میں ناکام رہے۔ اسرائیل نے محمود عباس کے ساتھ ٹھیک
طرح سے معاملات نہیں نبھائے۔ (یہاں پر یہ بتانا ضروری ہے کہ حماس کے لوگ الفتح
سے اسی بات پر ناراض ہیں کہ وہ اسرائیل اور امریکہ کے اشاروں پر ناچ رہی ہے)
اسرائیل کی حکومت امن کے معاملے میں سنجیدہ نہیں وہ دنیا کو گمراہ کرنا چاہتی ہے۔ انھوں
نے کہا کہ جب تک اسرائیل امن کا معاہدہ نہ کرے اس کو امن کے فوائد نہیں ملنے
چاہئے۔ ان سے میں نے ٹونی بلیئر کے امن مشن کے بارے میں پوچھا تو ڈاکٹر احمد نے
کہا کہ ٹونی بلیئر آئے، باتیں کیں اور چلے گئے مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ ہم کو اقتصادی اور

معاشی امداد کی لالچ دینے لگے لیکن ہم نے ان سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ہم کو آزادی پہلے چاہئے اور اقتصادی و معاشی امداد بعد میں ۔ڈاکٹر صبوح نے کہا کہ اس وقت اسرائیل کے پاس صرف تین متبادل بچے ہیں۔ اول تو یہ کہ وہ حالات کو جوں کا توں رہنے دے اور اپنی طاقت کے بل پر اکڑتا رہے لیکن اس صورت میں وہ امن کے ساتھ رہ نہیں سکتا۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اسرائیل اس بات کا کھل کر اعلان کردے کہ وہ مقبوضہ علاقوں کو خالی نہیں کرے گا اور ایک یہودی مملکت کا قیام کرے گا جس میں فلسطینی ایک اقلیت کا درجہ رکھتے ہوں گے۔ لیکن یہ راستہ اگر کھلا ہوتا تو اسرائیل اس پر کب کا عمل کر چکا ہوتا۔ تیسرا متبادل یہ ہے کہ اسرائیل فلسطینی مملکت کے قیام کو جلد از جلد منظوری دے اور دوقومی نظریہ کا احترام کرے، یہی راستہ اس کے لئے بہتر ہے۔ آخر میں ڈاکٹر احمد صبوح سے میں نے پوچھا کہ حزب اللہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ حزب اللہ ہمارے لئے ایک ماڈل تنظیم ہے اس نے ہمیں سکھایا ہے کہ اسرائیل کو کیسے شکست دی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر احمد لنچ کے فوراً بعد چلے گئے لیکن بعد میں وہاں موجود کچھ اور فلسطینیوں سے ہم لوگوں نے کھل کر باتیں کیں۔ ایک فلسطینی نوجوان نے ہم لوگوں سے کہا کہ یہ مذہبی معاملہ نہیں ہے یہ غاصب اور مغصوب کا معاملہ ہے لیکن کچھ Lobbies نے اس کو مذہبی معاملہ بنا دیا ہے (حماس، ایران اور حزب اللہ کا ماننا ہے کہ یہ اسلام اور صہیونیت کی جنگ ہے) دوسرے فرد نے کہا کہ اسرائیل چاہتا ہے کہ عرب ممالک سے تعلقات قائم ہوجائیں اور فلسطینیوں کو ان کے حقوق بھی نہ دینا پڑیں۔ اس نے مزید کہا کہ اسرائیل جھوٹ موٹ کے امن ڈیلی گیشن لاتا رہتا ہے۔ اس سے قبل اسرائیل کچھ عربوں کو لے کر آیا اور ان کو





عرب لیگ کا ڈیلی گیشن کہہ کر دنیا کو گمراہ کرنے کی کوشش کی بعد میں اس کی خود عرب لیگ نے تردید کی۔ وہ شطرنج کی چالوں کی طرح امن کے مہرے آگے پیچھے کرتا رہتا ہے اسرائیل کو امن میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کو تو بس اپنا قبضہ قائم رکھنے میں دلچسپی ہے۔ وہ اس زرخیز زمین سے کیسے دستبردار ہوسکتا ہے؟ یہاں پانی کے ایسے ذخائر ہیں جن سے اسرائیل کی حکومت اپنے شہریوں کے لئے 70 فیصد پانی حاصل کرتی ہے لیکن ہمارے بچوں کو پانی کے لئے ترساتے ہیں اور ہفتہ میں صرف دو دن پانی کی سپلائی ہوتی ہے۔ اس کی بات سن کر مجھے عرفان صدیقی مرحوم کا شعر یاد آیا:

تم ہی صدیوں سے یہ نہریں بند کرتے آئے ہو
مجھ کو لگتی ہے تمہاری شکل پہچانی ہوئی

اس فلسطینی نوجوان نے یہ بھی بتایا یہاں پیدا ہونے والی سبزیاں بھی اسرائیل کی ضروریات کا نوے فیصد حصہ پورا کرتی ہیں۔ بحر معیت کے معدنی ذخائر کا بھی اسرائیل بے دردی سے استحصال کر رہا ہے۔ اس لئے دنیا یہ امید نہ رکھے کہ اسرائیل ان علاقوں سے اتنی آسانی سے دستبردار ہوجائے گا۔ وہ شکست کھائے بغیر یہ زمین نہیں چھوڑے گا۔

عرب اسٹڈیز سوسائٹی کے ایک ممبر خلیل ایم تفکغی نے کہا کہ اسرائیل ایک طرف تو امن کے وفد لا رہا ہے اور دوسری طرف فلسطینیوں پر لگاتار ظلم کر رہا ہے۔ اسی سال جنوری سے اگست تک سیکڑوں مکان اور دکانیں برباد کی جاچکی ہیں لیکن افسوس کہ ان کی کوئی خبر شائع نہیں ہوئی۔ یہ نسل کشی ہے، نہ صرف اسرائیل کی طرف سے بلکہ اس بین الاقوامی برادری کی طرف سے بھی جو اسرائیل کا ساتھ دے رہی ہے۔ خلیل نے یہ بھی بتایا کہ 2007 میں صرف جولائی کے مہینے میں فائرنگ کے 222 واقعات ہوئے جس

میں اسرائیلی فوج کے ہاتھوں 32 فلسطینی شہید اور 113 زخمی ہوئے۔ 391 فلسطینی جوانوں کو پولیس نے قیدی بنایا۔ اسرائیل نے 409 نئے چیک پوائنٹ بنائے تاکہ فلسطینیوں کو پریشان کیا جاسکے۔ 668 بار اسرائیلی فوج فلسطینیوں کے گاؤں اور شہروں میں داخل ہوئی اور خواتین کی بے حرمتی کی۔ 145 راستوں پر فلسطینیوں کی آمد ورفت پر پابندی لگائی۔ 39 مرتبہ اسرائیلی غاصبوں نے حملے کر کے ان گنت گھروں کو برباد کیا۔ عرب اسٹڈیز کے ممبر نے کہا کہ سال 2007 کے اگست مہینے کے پہلے ہفتے میں 5 فلسطینی نوجوان ہلاک اور 21 زخمی ہوئے۔ 49 نوجوانوں کو پولیس گھروں سے اٹھا کر لے گئی۔ ایک ضعیف خاتون نے جب اپنے بیٹے کو گرفتاری سے بچانے کی کوشش کی تو اسرائیلی فوج کی زیادتی کے سبب وہ خود شہید ہوگئی۔ اسرائیل نے ہمارے علاقے میں ہم پر ہی بہت سی سڑکیں بند کر دی ہیں اور ان سڑکوں پر صرف یہودی چل سکتے ہیں مسلمانوں کو چلنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک فلسطینی نے ہندوستانی ڈیلی گیشن کے ممبروں سے یہ بھی کہا کہ اچھا ہوا آپ لوگوں کے ساتھ شیخ عبدالعزیز بخاری نہیں آئے وہ اسرائیل کے ایجنٹ ہیں وہ سرکاری ملا ہیں، اگر وہ یہاں آتے تو شاید ان پر حملہ ہو جاتا۔ انھوں نے اپنا گھر شمعون کے ہاتھ بیچ کر فلسطینیوں کے ساتھ غداری کی ہے۔





# عیسائیوں کا درد

جب انڈین ڈیلی گیشن نے رملہ سے واپس چلنے کا قصد کیا اور سب لوگ ہندوستانی سفارتی مشن کی بلڈنگ سے باہر نکلنے لگے تو معلوم ہوا کہ بس خراب ہوگئی اور ابھی رملہ سے نکلنے میں ایک گھنٹہ مزید لگے گا۔ ہم تینوں صحافیوں کے لئے یہ ایک اچھی خبر تھی کیوں کہ ہم لوگوں کو اپنے فلسطینی بھائیوں سے گفتگو کرنے کے لئے مزید وقت مل گیا تھا۔ اس موقع پر جمال جمعۃ نے ہم کو بتایا کہ بیت المقدس کے لئے اسرائیل کے منصوبے بہت خطرناک ہیں اور اگر عالم اسلام نے اس سلسلے میں ذرا سی بھی کوتاہی برتی تو مسجد اقصیٰ کا بھی (خدانخواستہ) وہی حشر ہوگا جو ہندوستان میں بابری مسجد کا ہوا۔ فلسطینی لیڈر جمال جمعۃ نے ہم لوگوں کو اسرائیل کے قدامت پسند یہودیوں کی ویب سائٹ کے کئی مناظر بھی دکھائے جن میں مسجد اقصیٰ کی جگہ جبل ھیکل یعنی Temple Mount دکھایا گیا تھا۔ اس سائٹ کو جمال جمعۃ نے ہمیں Animation کے ذریعہ کئی بار دکھایا اور بتایا کہ یہودیوں کا اصل خواب یہی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسرائیل کی جانب سے مسلسل سازشیں کی جارہی ہیں اور اسرائیل کی حکومت خفیہ طور پر مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگیں کھود رہی ہے۔

جمال جمعۃ نے ہندوستانی صحافیوں کو بتایا کہ اسرائیل بنائے جانے کا ڈیکلریشن 1917 میں پاس ہوا اور 1918 میں فلسطین برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد یہودی ایک منظم سازش کے تحت یہاں بسنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ اس غیر قانونی آبادی کے خلاف فلسطینی مسلسل احتجاج کرتے رہے۔ 1919 میں برطانوی قبضہ کے خلاف

بغاوت ہوئی مگر برطانیہ کی طاقت کے آگے ہماری کچھ نہ چل سکی۔ دس سال بعد پھر فلسطینیوں نے یہودیوں کی آبادکاری کے خلاف بغاوت کی مگر پھر ناکام رہے، اس کے دو سال بعد 1931 میں حیفہ میں فلسطینی قوم اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اس بار بھی اس یک وتنہا گروہ کی خبر گیری کے لئے کوئی نہیں آیا۔ ذرائع ابلاغ کی کمی اور اخبارات وریڈیو پر برطانیہ کے تسلط کی وجہ سے ان بغاوتوں کی خبریں دوسرے ملکوں کے عوام تک نہیں پہنچیں۔ ان ناکام بغاوتوں میں فلسطینیوں کے 531 گاؤں تباہ کئے گئے۔ آٹھ لاکھ مسلمان بے گھر اور بڑے پیمانے پر ہلاک ہوئے۔ 1948 تک اسرائیل میں صرف چھ لاکھ یہودی تھے مگر اس کے بعد ایک طوفان بے تمیز فلسطین میں وارد ہونے لگا اور اب ان کی تعداد پچپن لاکھ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسرائیل نے مشرق وسطیٰ میں (برہنہ) امریکی ثقافت اور عریاں تہذیب کو پھیلا دیا ہے کیوں کہ وہ مشرقی تہذیب کو قتل کرنا چاہتا ہے۔

مسلمان فلسطینیوں کے ساتھ کچھ عیسائی فلسطینی بھی ہندوستانی مشن کی بلڈنگ میں امن وفد سے ملنے آئے تھے۔ ان عیسائیوں میں سے مقامی رہنما مسٹر نیکورا نے مجھے بتایا کہ ان کا تعلق نزارت سے ہے۔ (نزارت فلسطین کا وہ علاقہ ہے جہاں عیسائی فرقہ اکثریت میں ہے) مسٹر نیکورا نے اسرائیلی چیرہ دستیوں کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس ملک میں تیسرے درجہ کے شہری بن گئے ہیں۔ یہودیوں کی یہی کوشش ہے کہ وہ تمام قوموں کو اجاڑ کر زیادہ سے زیادہ زمین حاصل کر لیں تاکہ مستقبل میں اور زیادہ یہودیوں کو یہاں منتقل کر سکیں۔ انھوں نے بتایا کہ صہیونی حکومت عیسائیوں پر بھی ظلم ڈھا رہی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ مسلمانوں کی دشمنی میں امریکہ اور برطانیہ کی حکومتیں عیسائیوں کو بھی ظلم وستم کا نشانہ بنتے ہوئے دیکھ رہی ہیں پھر بھی مجرمانہ طور پر اسرائیل کی مدد کر رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ





اسرائیلی کیبنیسٹ کے عیسائی ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر اعظمی پشارا کو اس لئے پارلیمنٹ کی سیٹ سے محروم کر دیا گیا کیوں کہ انھوں نے ایک ایسے سیکولر ملک کے قیام کی وکالت کی جس میں تینوں مذاہب کے ماننے والوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں۔ ظاہر ہے یہودی کبھی اس بات کو پسند نہیں کر سکتے کہ ان کی وہ مملکت جس کی ان کو توریت میں بشارت دی گئی ہے وہ چھین لی جائے اور اسرائیل کی متعصب یہودی سرکار کی جگہ کوئی سیکولر سرکار قائم ہو جائے۔ عیسائی نمائندے نے یہ بھی کہا کہ اگر اسرائیل کی طرف سے اسی طرح ظلم وستم جاری رہا تو وہ دن دور نہیں کہ سارے فلسطینی حماس کے ساتھ ہو جائیں گے اور اسرائیل کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا کیوں کہ حماس اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ حماس کا زور اتنا بڑھ گیا ہے کہ گزشتہ الیکشن میں مشرقی یروشلم کی چاروں سیٹوں پر حماس کا قبضہ ہو گیا تھا۔ (واضح رہے کہ مشرقی یروشلم کے مسلم باشندوں کو فلسطینی اتھارٹی کے الیکشن میں ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہے) ویسٹ بینک میں بھی حماس روز بروز مقبول ہو رہی ہے اور ہو سکتا ہے الفتح یہاں سے بھی غائب ہو جائے۔

اس بیچ ہماری بس ٹھیک ہو گئی اور یروشلم کی طرف واپسی کا سفر شروع ہوا۔ اسرائیل میں ہندوستانی وفد کے میزبانوں نے جو پروگرام طئے کیا تھا اس کے مطابق یروشلم میں پہلے ہم لوگوں کو ڈنر لینا تھا اور ڈنر کے بعد Western Wall Tunnel دیکھنے کے لئے جانا تھا۔ یہ سرنگ چار ہزار سال پرانی ہے اور دیوار گریہ کے عین نیچے واقع ہے۔ ہندوستانی وفد وہاں مقررہ وقت پر پہنچ بھی گیا۔ ہم صحافیوں کو بڑا تعجب تھا کہ اسرائیلی حکومت کیسے مان گئی کہ ایک غیر ملکی وفد (جس کے ساتھ صحافی بھی موجود ہیں) مغربی دروازے کے نیچے کی سرنگ میں جائے اور وہاں اپنی نگاہوں سے خفیہ طور پر چل رہی

سرگرمیوں کو دیکھے۔؟ ہندوستانی وفد اس سرنگ میں جانے کا انتظار کرتا رہا لیکن رات
گیارہ بجے تک اسرائیلی افسر یہی کہتے رہے کہ Tunnel کے اندر جانے والے
راستے پر تالہ پڑا ہے جس کا کلید بردار کہیں چلا گیا ہے۔ گیارہ بجے رات تک انتظار کرنے
کے بعد ہندوستانی وفد نا امید ہوکر ہوٹل کی طرف واپس روانہ ہوگیا کیوں کہ تالہ کی چابی
کسی طرح نہیں ملی۔

دوسرے دن صبح کو ہندوستانی وفد کو اسرائیل کی شرعی عدالت کے سربراہ قاضی احمد
ناثور کے دفتر (Israel Supreme Sharia Court) میں لے جایا گیا۔
اس عدالت میں مسلمانوں کے شادی بیاہ، طلاق اور خاندانی جھگڑوں کو حل کیا جاتا
ہے۔اس عدالت میں دئے گئے فیصلوں کو قانونی طور پر نافذ کیا جاتا ہے۔لیکن یہ سپریم
کورٹ محض ایک دھوکہ کے سوا کچھ بھی نہیں جہاں مسلمان بچوں کو مقدمہ چلائے بغیر جیل
کی سلاخوں کے پیچھے برسوں رکھا جاتا ہو جہاں ذرا ذرا سی بات میں گولی مار دینا عام بات
ہو وہاں اس طرح کی عدالت کا کیا مطلب ہے؟ یہ کام تو ہمارے ملک میں قاضی حضرات
ہر گلی کوچے میں کیا کرتے ہیں۔ اس ادارے کی وہی حیثیت ہے جو ہمارے ملک
میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی ہے۔لیکن دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے یہ عدالت اسرائیل کی
حکومت کے فنڈ سے چلائی جارہی ہے۔ عدالت کے سربراہ قاضی ناثور نے کہا کہ
ہمارے اختیارات بہت محدود ہیں اور اسرائیل کی حکومت اس عدالت کے لئے بہت ہی
مختصر سی رقم فراہم کرتی ہے، جس سے یہاں کی بلڈنگ کا کرایہ اور اسٹاف کی تنخواہیں بمشکل
ادا کی جاسکتی ہیں۔اس سچائی کے باوجود انڈین ڈیلی گیشن کے ایک ممبر نے اس طرح کی
شرعی عدالت کی بہت تعریف کی (حالانکہ مولانا نے اس عدالت کے سائن بورڈ کے علاوہ





کچھ دیکھا نہیں تھا) اور ڈینگ مارتے ہوئے کہا کہ ہم ہندوستان میں بھی اسی طرح کی
عدالتوں کے قیام کی کوشش کریں گے۔

جب تک ہندوستانی وفد وہاں گفت وشنید میں مصروف تھا۔ہم تینوں صحافیوں کو شرعی
عدالت کے کمپیوٹر پر بیٹھ کر انٹرنٹ کے ذریعہ اپنے اپنے دفتروں کے لئے خبر بھیجنے کا موقع
مل گیا۔شرعی عدالت کے فلسطینی کارکنان ہم لوگوں کے ساتھ بہت محبت سے پیش
آئے۔بار بار چائے پانی سے ہماری تواضع کرتے رہے۔ان کو لگتا ہوگا کہ شائد ہم لوگ
اپنے وطن واپس جاکر ان کی داستان کرب ضرور تحریر کریں گے۔

یہاں سے نکلنے کے بعد ہندوستانی وفد کو یہودیوں کے سب سے بڑے مذہبی
رہنماؤں کے دفتر میں لے جایا گیا جن کو چیف ربّائی کہا جاتا ہے۔چیف ربّائی کے آفس
میں یہودیوں کے علماء کی ایک فوج موجود تھی۔یہاں ہندوستانی وفد کو اسرائیل کے چیف
ربّائیوں Shlomo Moshe Amar اور Yona Metzeger سے
ملاقات کرنا تھی۔یہ دونوں ربائی چمکیلی عبا اور زرق برق قبا پہنے تھے۔ان کے سروں پر
ویسی ہی رنگین پگڑیاں تھیں جیسی ہمارے ملک میں جادو کا کھیل دکھانے والے مداری پہنے
رہتے ہیں۔

چیف ربائی کے دفتر میں پہنچنے کے بعد صحافیوں کو معلوم ہوا کہ ہندوستانی وفد کسی
معاہدے پر دستخط کرنے والا ہے۔صحافیوں کا تجسس بڑھ گیا۔اس موقع پر مولانا افضال
نظامی نے کہا چوں کہ ان کو امن معاہدے کے مسودے کا متن تو نہیں معلوم ہے اس لئے وہ
اس پر دستخط نہیں کریں گے۔وفد کے ایک اور ممبر خواجہ افتخار نے بھی بعض نا معلوم وجوہات
کی بنا پر امن معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔اس طرح معاہدے پر صرف دو

لوگوں یعنی مولانا عمیر الیاسی اور مولانا حفظ الرحمٰن میرٹھی نے دستخط کئے۔ یہ مضحکہ خیز منظر بھی عجیب تھا کہ جب دنیا بھر کے یہودیوں کے دو سب سے بڑے ربّائی یعنی روحانی رہنما ہندوستان کے دو گمنام اور غیر معروف مسلمان لیڈروں کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔ پتہ نہیں یہودی ربّائی دنیا کو دھوکہ دے رہے تھے یا اپنے آپ کو فریب دے کر خوش تھے۔ اصل میں ہندوستان میں ہونے والے مظاہروں کے سبب یہودیوں کو یہ لگنے لگا تھا کہ جو علما وفد میں شامل ہیں، ان کی ہندوستان میں بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ہندوستان کی تنظیم ائمہ مساجد اور The Chief Rabbinate of Israel کے بیچ ہوئے اس معاہدے میں دونوں مذہبوں کو حضرت ابراہیمؑ کی امت قرار دیتے ہوئے آپسی اتحاد اور اتفاق بڑھانے پر زور دیا گیا تھا۔ یہودیوں نے بڑی چالاکی کے ساتھ اس مسودے میں پیغمبر حضرت محمدؐ کا نام نہیں آنے دیا کیوں کہ وہ آنحضرتؐ کی نبوت پر یقین ہی نہیں رکھتے ہیں اسی لئے انھوں نے صرف حضرت ابراہیمؑ کا ذکر کیا۔

اس معاہدے میں کہا گیا تھا کہ دونوں مذاہب کے یہ لیڈر، ان لوگوں کی مذمت کرنے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں جو مذہب کے نام پر کشت وخون کا بازار گرم کرتے ہیں یا لوگوں کو ایسا کرنے پر اکساتے ہیں۔ یہ اشارہ کس کی طرف تھا اس کا اندازہ لگانا بہت آسان تھا کیوں کہ یہودی ہر قسم کے تشدد کے لئے صرف مسلمانوں کو ہی ذمہ دار ٹھہراتے رہے ہیں۔ اس پورے معاہدے میں فلسطین کے ان مظلوم باشندوں کے بارے میں ایک بھی لفظ نہیں تھا جن کا پچھلے 60 برسوں سے اسرائیل استحصال کرتا آرہا ہے۔ اس معاہدے میں قبلۂ اول کے بارے میں بھی کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ دنیا بھر کے رہنماؤں سے یہ اپیل کی گئی تھی کہ وہ اس پاک سرزمین میں چل رہے قضیوں کے دائمی حل کے لئے





کوششیں تیز کریں۔ اس معاہدے میں اسرائیل کی سرکار سے کوئی بات نہیں کہی گئی بلکہ عالمی رہنماؤں سے آگے آنے کے لئے کہا گیا تھا۔ جبکہ مسئلہ فلسطین کے حل نہ ہونے میں اسرائیل کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ہندوستانی وفد نے اس معاہدے میں اس بات کا اعادہ کیا تھا کہ جس طرح ہندوستان میں یہودی اور مسلمان بہت سکون کے ساتھ رہتے ہیں، یہودی لیڈروں سے اس ملاقات کے بعد ہماری کوشش یہی ہوگی کہ دوسری جگہوں پر بھی یہودی، عیسائی اور مسلمان اسی طرح مل جل کر رہیں لیکن ہندوستانی وفد یہ بات بھول گیا کہ ہندوستان اور اسرائیل کا کوئی موازنہ ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ ہمارا ملک ایک سیکولر ملک ہے اس کے برعکس اسرائیل صرف ایک مذہب پر یقین رکھنے والے لوگوں کا متعصب لوگوں کا ملک ہے جہاں دوسرے فرقوں کو برابر کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔

اس معاہدے پر دستخط کے بعد ہندوستانی صحافیوں کو چیف ربّائی سے کچھ سوال کرنے کی اجازت مل گئی۔ میں نے راشٹریہ سہارا کے نمائندے کی حیثیت سے چیف ربّائی شلومو موشے امر سے پوچھا کہ فلسطینیوں کو شکایت ہے کہ اسرائیلی سرکار امن کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے آپ ان کو سنجیدگی کا مشورہ کیوں نہیں دیتے؟ اس پر انھوں نے کہا کہ فلسطینی کہتے ہیں کہ اسرائیلی سنجیدہ نہیں ہیں اور اسرائیلی کہتے ہیں کہ فلسطینی سنجیدہ نہیں ہیں، لیکن سچ ان دونوں کے موقف کے درمیان میں کہیں پوشیدہ ہے۔ اصل میں دونوں کو ایک دوسرے پر شبہ ہے۔ چیف ربّائی نے پھر تمام ذمہ داری مسلمانوں پر تھوپتے ہوئے کہا کہ یہ شک وشبہ کا ماحول اس لئے پیدا ہوا کہ یہودی مملکت کے خلاف بچپن سے ہی لوگوں کے ذہنوں کو زہر آلود کر دیا جاتا ہے۔ ایک اسٹریو ٹائپ امیج یہودی مملکت کے بارے

میں قائم کر دی گئی ہے۔ انھوں نے بات بدلتے ہوئے کہا کہ اب فلسطینی ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں جس سے ہم کو بہت تشویش ہے۔ اس لئے ہم لوگ مذہبی رہنماؤں سے بات چیت کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اسرائیل میں لوگوں کا خیال ہے کہ ہم لوگ بہت دے چکے ہیں اور فلسطینیوں پر مزید بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اب مزید سمجھوتہ نہیں کیا جانا چاہئے۔ ظاہر ہے یہ سب باتیں خود چیف ربّائی کے دل کی آواز تھیں جس کو انھوں نے کچھ لوگوں کے نام سے منسوب کر کے کہا۔

دوسرے چیف ربّائی یونا میٹز گر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے ابو مازن (محمود عباس) کو ایک بہترین تحفہ کے روپ میں غزہ دیا۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ یہ علاقہ امن کی علامت بنے۔ غزہ کے علاقہ کے یہودیوں نے آبیاری کی اور ایک لعنت زدہ زمین کو جنت میں بدل دیا اور جب ہم نے سمجھوتہ کیا تو اس زمین کو اس امید پر خالی کر آئے کہ ابو مازن ہم کو امن کے بدلے بم نہیں دیں گے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ جس دن ہم نے غزہ کو خالی کیا، فلسطینیوں نے ہمارے پچاس عبادت کدے (ھیکل) گرا دیئے۔ چیف ربّائی کی اس بات پر میرے پاس ہی بیٹھے شیخ عبدالعزیز بخاری نے کہا کہ یہ بیان ایک گمراہ کرنے والا جھوٹ ہے کیوں کہ سچ تو یہ ہے کہ جس دن یہودیوں نے غزہ کو خالی کیا انھوں نے وہاں کی تمام کالونیوں کو خود ہی بموں سے اڑا دیا تاکہ ان میں فلسطینی رہنے نہ پائیں۔ اس کے علاوہ جب وہاں سے اسرائیلی فوجیں چلیں تو انھوں نے قابل کاشت زمین میں مضر کیمیکلز ڈال کر زمین کو بنجر بنا دیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ اپنے معبدوں کو نہیں گرا سکے کیوں کہ اس کی ان کے مذہب میں اجازت نہیں تھی۔ پورے ویران شہر میں پچاس یہودی معبدوں کا مسلمان کرتے بھی کیا؟





دہشت گردی کا ذکر کرتے ہوئے چیف ربّائی نے کہا کہ لوگوں کا پہلے یہ خیال تھا کہ صرف یہ علاقہ دہشت گردی کا شکار ہے لیکن اب دہشت گردی ساری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ حال ہی میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح عراق میں یزیدی فرقہ کے پانچ سو لوگوں کو دہشت پسندوں نے ہلاک کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے لیکن کچھ لوگ اس کا دوسرا چہرہ پیش کر کے دہشت گردی کو فروغ دے رہے ہیں۔ یہ عناصر کہتے ہیں کہ اپنی جان دینے والا شخص جنت میں جائے گا۔ چیف ربّائی نے تنظیم ائمہ مساجد کے وفد سے کہا کہ اگر آپ دہشت گردی کے خلاف زبان نہیں کھولیں گے تو اللہ آپ سے باز پرس کرے گا۔ چیف ربّائی نے اس وفد کی ہمت کی داد دیتے ہوئے کہا کہ میں آپ کو تہہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہندوستان میں چل رہے مظاہروں کے باوجود یہاں آنے کی زحمت گوارہ کی۔ ربّائیوں کے ساتھ اس میٹنگ میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس میں امریکہ کی راجدھانی واشنگٹن کی ایک مسجد کے امام شیخ یحییٰ الھندی بھی خاص طور سے شرکت کے لئے بلائے گئے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر امریکہ میں سیکولرزم کے قصیدے پڑھے۔

میٹنگ کے بعد عمیر الیاسی نے چیف ربّائی سے کہا کہ ہندوستان کی مسجدوں کے پانچ لاکھ اماموں کے رہبر مولانا جمیل الیاسی صاحب نے آپ سب (اسرائیل والوں) کے لئے صلح اور امن و آشتی کا پیغام بھیجا ہے۔ اس پیغام میں مولانا الیاسی صاحب کی طرف سے ان عقائد کی نشاندہی کی گئی تھی جو یہودیوں اور مسلمانوں میں مشترک ہیں۔

وفد کی سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ اس میں خواجہ افتخار کے علاوہ کسی کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ اس لئے ایک ایک بات کا ترجمہ ٹور کی کوارڈی نیٹر پریہ ٹنڈن کرتی تھیں۔ ان کے

آدھے ادھورے ترجمہ کے سبب دونوں وفود کو ایک دوسرے کی باتیں پوری طرح سے
سمجھنے میں دقت ہوتی تھی اس لئے کئی بار خواجہ افتخار ترجمہ کرنے کا کام اپنے ہاتھ میں لے
لیتے تھے۔

اس موقع پر یہودی ربّائیوں کو ہندوستانی وفد نے قیمتی تحائف پیش کئے اور جواب
میں چیف ربّائی نے مولانا عمیر الیاسی کو سونے اور چاندی کا بنا ہوا یروشلم کا چھوٹا سا ماڈل
پیش کیا۔اس ماڈل کو ہاتھوں میں اٹھا کر ہندوستانی وفد کے ایک ممبر نے کہا کہ اب ہم
امن کا یہ پیغام دنیا بھر میں لے جائیں گے۔ مجھے یہ بات سن کر بہت زور سے ہنسی آگئی
کہ جو لوگ اپنے ہی ملک میں اپنی ہی قوم کے اجتماعات میں اسرائیل کے ساتھ امن
کرنے کی بات کہنے کی ہمت نہیں کر سکیں گے وہ بھلا دنیا بھر میں امن کی بات کس منہ
سے کریں گے؟

میٹنگ برخاست ہونے کے بعد ہندوستانی اور اسرائیلی صحافیوں کو معاہدے کی
کاپیاں تقسیم کی گئیں۔اس معاہدے کا مسودہ اسرائیل کے چیف ربّائی کے دفتر اور تنظیم
ائمہ مساجد کے لیٹر پیڈ پر تیار کیا گیا تھا۔ربّائیوں سے ہندوستانی وفد کی ملاقات کو اسرائیل
کے میڈیا نے کافی اہمیت دی اور یہاں پریس اور ٹیلی ویژن کے نمائندے کافی تعداد
میں دکھائی پڑے ۔





# شمعون پیریز سے وفد کی ملاقات

اسرائیل کے ربّائیوں سے ملنے کے بعد ہندوستانی وفد شام کو اسرائیل کے صدر مملکت
شمعون پیریز کے گھر پر ان سے ملاقات کے لئے پہنچا۔کڑی تلاشی کے بعد یہ لوگ اندر
داخل ہو سکے اور تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد شمعون پیریز نے ان سے ملاقات
کی۔اس موقع پر اسرائیل کی وزارت خارجہ کے کئی ذمہ دار اور اسرائیل کی خفیہ سروس کا
ایک سابق افسر عران لرمین بھی موجود تھا۔ہندوستانی وفد کا خیر مقدم کرتے ہوئے شمعون
پیریز نے کہا کہ ہندوستان نے زبردست ترقی کی ہے۔ وہاں کا کلچر اور وہاں کی تہذیب
بہت ہی خوبصورت اور قابل رشک ہے۔شمعون نے کہا کہ ہندوستان میں الگ الگ
مذاہب کا ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا قابل رشک اور ایک الگ قسم کا تجربہ ہے۔
شمعون نے کہا کہ کسی زمانے میں صرف چرچ اور حکومت کے بیچ ہی ٹکراؤ تھا لیکن اب
سب ہی مذاہب انتہا پسندی اور فساد سے پریشان ہیں۔کوئی بھی خدا قتل و غارت گری کی
اجازت نہیں دیتا۔(میں حیران تھا کہ جس ملک کی بنیاد قتل و غارتگری پر ہی قائم ہے اس کا
صدر کس خدا کی دہائی دے رہا ہے؟) اس نے آگے کہا کہ ہماری زبانیں الگ ہیں لیکن
سب کا خدا ایک ہے۔ ہم مسلمانوں کو اپنے دشمن کی طرح نہیں دیکھتے سب حضرت
ابراہیم کی اولاد ہیں اور ہم خود کو کسی سے برتر نہیں سمجھتے (یہ بات اسرائیلی بار بار اس لئے
کہہ رہے ہیں تاکہ عرب اسرائیل قضیہ کے نام سے چل رہا چھ دہائی پرانا تنازعہ کسی طرح
بھی اسلام بنام صہیونیت میں تبدیل ہونے نہ پائے۔جب تک یہ جھگڑا فلسطینیوں کے
نام منسوب ہے اسرائیل دنیا بھر کے مسلمانوں کو اس معاملے سے الگ رکھ کر من مانے

جرائم کرتا رہے گا۔ جہاں تک خود کو برتر سمجھنے کی بات ہے تو یہ بات بھی یہودیت کی تمام کتابوں میں موجود ہے کہ وہ خدا کی پسندیدہ قوم ہیں اس لئے مساوات اور برابری کا دعویٰ سراسر جھوٹ کے سوا کچھ نہیں ہے ) پیریز نے یہ بھی کہا کہ مسلمان اور یہودی قتل و غارت گری کے خلاف ہیں۔ (مسلمانوں کے بارے میں تو یہ سچ ہے کیوں کہ انھوں نے اپنے دور اقتدار میں یروشلم میں رہنے والے کسی یہودی کو قتل نہیں کیا لیکن یہودی کس منھ سے اس بات کا دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ قتل و غارتگری کے خلاف ہیں؟ ان کی بربریت کی داستانیں تو فلسطین کی ہر سڑک پر فلسطینیوں کے سرخ خون سے تحریر ہیں ) اسرائیلی صدر نے ہندوستانی وفد کے ممبروں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ کی ہمت کی داد دیتے ہیں اور آپ کی تنقید کرنے والوں کی مذمت کرتے ہیں اور آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کے یہاں آنے کی بہت اہمیت ہے۔ (اسرائیلی صدر ایک ایسے وفد کی اہمیت جتا رہا تھا جس میں کوئی بھی قابل ذکر مولوی یا عالم دین موجود نہیں تھا۔) اسرائیلی صدر نے کہا کہ اسرائیل میں مسلمان ایک بہت بڑی اقلیت ہیں اور ان کو اس ملک میں برابری کے حقوق حاصل ہیں۔ (اس دعویٰ کے جھوٹ ہونے کے بارے میں اس کتاب میں کئی واقعات پیش کئے جا چکے ہیں ) اسرائیل کے صدر نے کہا اسرائیل اپنے پڑوسیوں کے ساتھ امن چاہتا ہے اور برابری کے سلوک کا خواہاں ہے۔ آخر میں اس نے کہا کہ یہ ہندوستانی وفد امن و مساوات کا پیغام لایا ہے۔ اپنی جوابی تقریر میں وفد کے ایک اہم رکن عمیر الیاسی نے کہا کہ ہم بہت سی تنقیدوں کا نشانہ بننے کے بعد یہاں آئے ہیں۔ ہم ابوغوش وغیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ آپس میں کافی بھائی چارہ ہے ( ابوغوش کے مسلمانوں کی اصلی تصویر بھی اس کتاب میں لکھی جا چکی ہے ) انہوں نے آگے کہا کہ مسلم





شریعت کورٹ دیکھ کر ہم کو بہت اچھا لگا۔ کل ہم رملہ گئے جہاں فلسطین کے نائب وزیر خارجہ سے مل کر اچھا لگا۔ ہم مسجد اقصیٰ بھی گئے اور یہودیوں کے علاقے بھی ہم نے دیکھے۔ ہم کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان علاقوں میں سب مل کر رہتے ہیں۔ انھوں آخر میں کہا کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی بے گناہ کو قتل کیا جائے۔ مسلمانوں اور یہودیوں کو آپس میں مل بیٹھ کر بات کرنا ہوگی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ یہ معاملہ حل ہو۔ (ہندوستان میں ہونے والے مظاہروں کا اس ڈیلیگیشن کو بہت فائدہ ہوا کیوں کہ ان مظاہروں کی وجہ سے اس وفد کی اہمیت اسرائیلی حکومت کی نظر میں کافی بڑھ گئی تھی )

میٹنگ کے بعد ہندوستانی وفد نے پیریز شمعون کو شال اڑھائی تو مجھے لگا کہ جیسے کسی فلسطینی کی لاش پر پڑا کفن اٹھا کر شمعون کے کاندھوں پر ڈال دیا گیا ہو۔ اس کے بعد ہندوستانی وفد نے اس عہد کے سب سے بڑے ظالم و جابر ملک کے صدر کو عدم تشدد پر یقین رکھنے والے مہاتما گاندھی کا مجسمہ بھی پیش کیا۔ شائد مرنے کے بعد گاندھی جی کی آتما کو زخمی کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ گاندھی جی کا مجسمہ شمعون پیریز کے ہاتھوں میں دیکھ کر محسوس ہوا کہ جیسے قاتلوں کے کسی سردار کو شاخ زیتون پیش کی جا رہی ہو۔ اتفاق سے گاندھی جی کے مجسمہ کا شوکیس ہوائی جہاز کے سفر کے دوران ٹوٹ گیا تھا اور مجسمہ کا اسٹینڈ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ سجانے کے قابل نہیں رہا۔ گاندھی جی کی آتما کو مجسمہ ٹوٹنے سے شاید تھوڑی شانتی ملی ہوگی اور ان کی آتما اپنے آپ سے کہہ رہی ہوگی باپو شکر ادا کرو کہ تم قاتلوں کے ڈرائنگ روم میں سجنے سے بچ گئے۔

اس میٹنگ کے بعد میں نے پیریز سے پوچھا کہ فلسطینیوں کو ان کے حقوق دینے کے لئے ان کی حکومت کیا کر رہی ہے؟ تو پیریز شمعون نے کہا کہ ہم کو لگتا ہے کہ ابو مازن

(محمود عباس) امن قائم کرنے کے لئے ایک بہتر اور موزوں آدمی ہیں ۔ ہماری طرف
سے مزید گفتگو چل رہی ہے۔ ہم نے امن کے سلسلے میں کافی پیش رفت کی ہے۔ ہمارے
پرائم منسٹر یہوداولمرٹ ابو مازن سے لگاتار بات کر رہے ہیں۔ پہلے ہم نے اردن اور مصر
سے مصالحت کی اور اب فلسطین سے مصالحت کی بات کر رہے ہیں۔(اسرائیلیوں کی
مصالحت کے ڈرامے کے بارے میں آپ فلسطینیوں کی رائے تو پڑھ ہی چکے ہیں)

پی ٹی آئی کے صحافی ذیشان حیدر نے جب ان سے یہ پوچھا کہ اسرائیل اور فلسطین کے بیچ
کب تک امن قائم ہو جائے گا؟ تو شمعون پیریز نے کہا کہ ہم کو لگتا ہے اب یہ گھڑی کافی
نزدیک ہے اور مصالحت کا وقت آ گیا ہے لیکن امن کے معاہدے سے قبل ایک ایسی دستاویز
تیار ہونا ہے جس میں اصول وضوابط تحریر کئے جائیں گے تاکہ دونوں کے بیچ اعتماد قائم ہو
سکے( کچھ بھی کہئے اسرائیل کے لیڈروں کے لہجے میں حزب اللہ سے جنگ میں شکست اور
حماس کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت کے سبب نرمی آئی ہے۔اب وہ اس لہجے میں بات نہیں
کرتے جیسا کہ ان کی عادت رہی ہے)

ہندوستان اور اسرائیل کے تعلقات کے سلسلے میں پوچھے گئے ایک اور صحافی کے سوال
کے جواب میں شمعون نے کہا کہ انڈیا نے بہت سی پریشانیوں کے باوجود اپنی جمہوریت
کو برقرار رکھا ہے۔انھوں نے کہا کہ انڈیا سے اسرائیل کے بہت اچھے رشتے ہیں۔شمعون
کا یہ جملہ صرف ہوا میں نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی حکومت اور اسرائیل کے درمیان اندر ہی
اندر بہت زیادہ ربط وضبط بڑھ گیا ہے۔ بی جے پی کے دور اقتدار میں حکومت ہند نے
اسرائیل سے ہتھیار خریدنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔(
اسی کے ساتھ دفاعی سودوں میں کمیشن کی خبریں بھی روز آ رہی ہیں۔گزشتہ آٹھ برسوں میں





ہندوستان نے اسرائیل سے اربوں ڈالر کے ہتھیار خریدے ہیں قارئین کو یہ جان کر حیرت
ہوگی کہ اس وقت ہندوستان اسرائیلی ہتھیاروں کا سب سے بڑا خریدار ہے۔آج کل
ہندوستان کی وزارت دفاع اسرائیل سے بغیر پائلٹ والے طیارے Unmanned
Aerial Vehicles اور بہت ہی اچوک نشانے والے ہتھیار Precision
Guided Munitions خرید رہا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسرائیل سے
2006 میں ہندوستان نے ڈیڑھ بلین ڈالر کے اسلحے خریدے ہیں ۔ ہندوستان اور
اسرائیل کے درمیان دفاعی معاہدوں کی کل قیمت بڑھ کر جلد ہی 30 بلین ڈالر تک پہنچنے
والی ہے۔ یہ سلسلہ ویسے تو بی جے پی کے دور میں شروع ہوا تھا لیکن کانگریس کے دور میں
یہ دفاعی تعلقات کافی پھولے پھلے۔

شمعون پیریز سے ملاقات کے بعد میری نظر وہاں بچھے بہت خوبصورت قالین پر پڑی
جس پر' بافت کرمان شاہ' لکھا تھا یعنی یہ قالین ایران کے کرمان شاہ شہر میں بنا گیا تھا۔
میں نے عران لرمین (لرمین ایران کے بدترین دشمنوں میں سے ایک ہے ) کو چھیڑنے
کے لئے کہا یہ تو ایرانی قالین ہے؟ اس پر اس نے بہت ہی برا سا منھ بنا کر کہا کہ کسی
زمانے میں ہمارے بھی ایران سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ہم شاہ ایران کو اپنا بھائی
مانتے تھے(ہر اسلام فروش اسرائیلی قوم کا بھائی ہوتا ہے) یہ قالین رضا شاہ پہلوی کا دیا
ہوا تحفہ تھا۔ پھر وہ بہت ہی معنی خیز انداز میں بولا آپ یقین رکھئے ہمارے ایران سے پھر
بہت گہرے تعلقات ہوں گے۔اس جملہ پر ذیشان حیدر نے تعجب سے کہا کیا اسرائیل
اور ایران کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہوسکتے ہیں؟ لرمین نے کہا ہاں ۔۔ بہت
جلد۔۔۔ وہاں کی موجودہ اسلامی حکومت اقتدار سے محروم ہونے والی ہے اس کے بعد وہ

پھر سے ہمارا دوست ہو جائے گا۔(بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں، یہ کہاوت یہاں بالکل صادق ہوتی نظر آ رہی تھی) اس پر اس ہندوستانی صحافی نے پوچھا کہ آپ کب تک یہ امید کرتے ہیں کہ وہاں کی اسلامی حکومت اقتدار سے بے دخل ہو جائے گی۔تو لرمین نے کہا 2009 تک۔۔۔اس پر اس صحافی نے حیرت سے کہا وہ کیسے؟ لرمین نے ایک امریکی کتے کی طرح بھونکتے ہوئے کہا کہ امریکی صدر جارج بش 2009 تک مسند اقتدار پر ہے اور اس کی ایک عادت ہے کہ وہ کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتا۔ایران کی اسلامی حکومت کا خاتمہ اس کے ایجنڈے میں شامل ہے اس کو وہ ضرور پورا کرے گا۔لرمین کی باتوں سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ امریکہ کا جلاد صفت صدر اسرائیل کے حکام کو اس بات کی یقین دہانی کروا چکا ہے کہ وہ اپنے دور اقتدار میں اسلامی ممالک کے خلاف چل رہی اپنی تحریک کو عراق اور افغانستان سے آگے بڑھا کر ایران کی سرحدوں تک ضرور لے جائے گا۔عران لرمین کی باتوں میں اسرائیل کے لوگوں کی وہ دشمنی صاف طور پر جھلک رہی تھی جو ان کے دلوں میں ایران کے لئے موجود ہے۔ ہر اسرائیلی کی نظر میں اس زمانے میں ان کا سب سے بڑا دشمن ایران ہے۔نفرت کا یہ رنگ عربوں سے منتقل ہو کر ایران کی طرف صرف اس لئے مڑ گیا کہ ایرانی قیادت مسلمانوں کو اسرائیل کے خلاف متحد کرنا چاہتی ہے اس کے برعکس اسرائیل فلسطین کے مسئلے کو ایک علاقائی قضیہ سے زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتا۔

شمعون سے ملاقات کے بعد میں اور ذیشان حیدر کچھ سامان خریدنے کے لئے مغربی یروشلم کی واکنگ اسٹریٹ میں رک گئے۔ایک یہودی عورت کی دوکان پر مجھے نسل پرستی کا پہلا سامنا ہوا۔میں نے سگریٹ کا پیکٹ خریدنا چاہا تو اس نے نہایت حقارت سے





جھڑک دیا۔میں سمجھا کہ وہ میری انگلش نہیں سمجھ پا رہی ہے۔میں نے ایک یہودی راہگیر کو روک کر کہا کہ مجھے سگریٹ کا پیکٹ خریدنا ہے اس عورت کو بتا دیجئے۔اس عورت سے اس راہگیر نے عبرانی میں بات کی تو اس ملعون عورت نے پتہ نہیں کیا کہا لیکن وہ یہودی کہنے لگا کہ یہ آپ کے ہاتھ سگریٹ نہیں بیچے گی۔شائد میں صورت سے مسلمان لگ رہا تھا، اس لئے۔

کافی دیر بازاروں میں ہم گھومتے رہے جگہ جگہ بھکاری نظر آ رہے تھے اور کئی غریب یہودی بھی ناچ گا کر اور کمال دکھا کر پیسے مانگ رہے تھے۔میں نے سوچا کیا یہی ان کے خوابوں کی وہ جنت ہے جس کا ان سے توریت میں وعدہ کیا گیا تھا؟ یہیں ٹہلتے ٹہلتے شام ہو گئی اور ہم لوگ بیت موسیٰ نام کے اس دفتر میں پہنچ گئے جہاں ہندوستانی وفد کو ڈنر پر مدعو کیا گیا تھا۔بیت موسیٰ میں (ہی اس وفد کو بلانے والے ادارے) امریکن جوئیش کمیٹی کا دفتر ہے۔ڈنر میں کافی وقت تھا تو ہم دونوں یہاں کے کمپیوٹر پر انٹرنٹ کے ذریعہ رپورٹ بھیجنے میں لگ گئے۔اس کام میں کافی وقت گزر گیا اور اسی درمیان ہندوستانی وفد بھی ہوٹل سے وہاں پہنچ گیا۔

اس دفتر میں ہندوستانی نسل کے کئی یہودی بھی موجود تھے۔عران لرمین بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود تھا۔کھانے سے پہلے وفد کے ممبروں سے کہا گیا کہ وہ اس دورے کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کریں۔زیادہ تر لوگوں نے کہا کہ یہ دورہ بہت کامیاب رہا اور اس طرح کی کوششوں کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔کچھ لوگ تو اس حد تک قصیدے خوانی پر اتر آئے کہ جیسے بس یہی کہنے والے ہوں کہ اس وفد کے دورے کے بعد اسرائیل اور فلسطین کا مسئلہ پوری طرح سلجھ گیا ہے لیکن پتہ نہیں کیسے مولانا

افضال نظامی نے یہ کہنے کہ ہمت کر دی کہ جو یہودیوں کے ساتھ ہٹلر نے کیا وہی آج یہودی مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔اس کے علاوہ مولانا حفظ الرحمان میرٹھی نے بھی ماجد دیوبندی کے کچھ اشعار پڑھ دئے جن میں کہا گیا تھا کہ ہم ہر حال میں سچ بولیں گے اور اپنے ہونٹ نہیں سی سکتے۔انھوں نے ایک اور شعر پڑھا:

خوف کیا ہو ہمیں یزیدوں کا
ہم حسینی مزاج رکھتے ہیں

اس شعر کا ترجمہ نہیں کیا گیا شائد اس لئے بھی کہ اسرائیلیوں کو آج کل حسینی مزاج سے ہی سب سے زیادہ پریشانی ہورہی ہے۔اس لئے شعر کا مطلب صرف ہندوستانی وفد نے ہی سمجھا۔اس ڈنر میں اسرائیل کے افسروں نے ہندوستانی شرکاء کی شان میں قصیدے پڑھے۔میری باری آئی تو میں نے کہا اسرائیل کی حکومت امن مذاکرات کو لے کر سنجیدہ نہیں ہے اس پر ہماری میزبان پریہ ٹنڈن تھوڑی خفگی سے بولیں ایسا نہیں ہے سب لوگ سنجیدہ ہیں۔سب لوگ امن چاہتے ہیں۔ویسے بھی ان کو میری جانب سے کئے جانے والے سوال کافی پریشان کر رہے تھے اسی وجہ سے وہ بہت Uncomfortable لگ رہی تھیں۔جس کا اظہار انھوں نے مجھ سے دبی زبان سے کیا بھی مگر میں اپنی بات پر اڑا رہا۔اصل میں پریہ امریکی یہودیوں کی تنظیم کے لئے انڈیا میں کام کرتی ہیں تو انھیں تو یہ ثابت کرنا ہی تھا کہ یہ ٹور بے انتہا کامیاب رہا۔





# آخری دن کا پروگرام

پروگرام کے آخری دن وفد کو تین اداروں کی سیر کروائی جانا تھی۔پہلا تھا مہاجرین اور تارکین وطن کا ایک سنیٹر جس میں مختلف ملکوں سے آنے والے یہودیوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔اسرائیل کی حکومت کے قائم کردہ absorption Immigration and سینٹر میں اس وقت چھ ہزار یہودی نوجوان موجود ہیں جو مختلف ملکوں سے یہاں آئے ہیں اور اسرائیلی تہذیب، ثقافت اور عبرانی زبان سیکھ رہے ہیں۔اس انسٹی ٹیوٹ کا تعارف دیتے ہوئے مس پریہ ٹنڈن نے وفد کے اردو جاننے والے لوگوں سے کہا کہ یہاں دوسرے ممالک سے آنے والے افراد کو اسرائیل میں بسنے کے لئے مختلف سہولتیں دی جاتی ہیں۔اس پر میں نے پریہ ٹنڈن کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ اسرائیل آنے والے ہر آدمی کو نہیں صرف یہودیوں کو یہاں ٹھہرایا جاتا ہے۔(مجھے اس بارے میں پہلے سے معلوم تھا کیوں کہ میں نے انٹرنیٹ پر اس سلسلے میں پڑھ لیا تھا) پریہ ٹنڈن خفا ہو کر بولیں نہیں ایسا نہیں ہے یہاں ہر وہ شخص جو اسرائیل میں بسنا چاہتا ہے آکر رہ سکتا ہے اور جب تک اس کو کام کاج نہیں مل جاتا وہ یہاں سے مالی امداد بھی حاصل کرسکتا ہے۔پریہ ٹنڈن کی اس غلط بیانی پر میں چراغ پا ہو گیا اور اپنی بات کو ثابت کرنے کی فکر میں لگا رہا۔جب امیگریشن سینٹر کے اساتذہ نے وہاں کے کام کاج کے بارے میں بات کرنا شروع کی تو میں نے سب سے پہلے ان سے یہی سوال کیا کہ کیا ہندو مسلمان اور عیسائی بھی اگر اسرائیل میں آکر بسنا چاہیں تو ان کو یہی سہولیات دی جاتی ہیں؟ تو اس استاد نے مصلحت سے کام نہ لیتے ہوئے بالکل واضح اور دو ٹوک انداز میں جواب دیا کہ اسرائیل میں جتنے بھی ایسے امیگریشن سینٹر چل رہے ہیں سب

میں صرف یہودیوں کے لئے جگہ ہے دوسرے مذاہب کے لئے ہم نے یہ سینٹر نہیں کھولے ہیں۔اس طرح کے سینٹروں میں آنے والے یہودیوں کو مفت رہنے کی جگہ کھانا پینا اور اچھا خاصہ ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔جب یہاں رہنے والے عبرانی زبان سیکھ لیتے ہیں تو ان کے لئے نوکری کا انتظام کیا جاتا ہے اور رہائش کے لئے بینک سے آسان شرائط پر قرض دلوا کر مکان بھی دلوایا جاتا ہے۔ایک مقامی یہودی نے بتایا کہ یہاں آنے والے بہت سے نوجوان اپنے ملکوں سے ایک خاص مقصد کے تحت ہجرت کر کے آتے ہیں۔اسرائیل سے امریکہ جانے کا ویزہ آسانی سے مل جاتا ہے اس لئے پہلے یہ لوگ شہریت اختیار کرتے ہیں بعد میں امریکہ کے چکر لگاتے ہیں۔

اس ادارے میں کچھ دیر گزارنے کے بعد وفد کو غزہ کے قریب صدیروت قصبہ لے جایا گیا جہاں حماس کے قسام میزائل آئے دن گرتے رہتے ہیں۔





# غزہ کی سرحد پر

اسرائیل میں بسنے کے خواہش مند یہودیوں کے امیگریشن سینٹر کی کسی چیز سے مجھ کو دلچسپی نہیں تھی کیوں کہ یہاں سے ہم لوگوں کو سیدھے غزہ کے سب سے نزدیکی قصبہ صدیروت جانا تھا۔امیگریشن سینٹر میں میری دلچسپی اس لئے بھی کم تھی کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح کے سینٹر اس لئے چلائے جا رہے ہیں تا کہ دنیا بھر کے یہودیوں کو مذہب کے نام پر یہاں جمع کر کے مسلمانوں کو اقلیت میں کر دیا جائے۔کسی طرح سے امیگریشن سینٹر سے جان چھوٹی اور ہم لوگ وہاں سے تقریباً ایک سو پچیس کلومیٹر دور واقع صدیروت قصبہ کی طرف روانہ ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لوگ صدیروت پہنچ گئے۔یہ میدانی علاقہ ہے۔اس علاقہ میں ایتھوپیا، انڈیا اور امریکہ سے ترک وطن کر کے آنے والے 26 ہزار یہودی رہتے ہیں اس کو سی زون کہا جاتا ہے۔(اسرائیل کے تمام شہر تین زون میں بٹے ہوئے ہیں۔ان کو اے، بی اور سی ایریا کہا جاتا ہے۔اے زون مسلمانوں کی اکثریت والے علاقوں کو کہا جاتا ہے۔بی زون مشترکہ آبادی والے علاقوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جب کہ سی زون ان علاقوں کو کہا جاتا ہے، جہاں صد در صد یہودی آباد ہیں۔ان علاقوں میں تفریق ایک عام سی بات ہے جہاں صد فی صد مسلمان ہیں وہاں آپ کو شہری سہولتوں کی کمی کی شکایت ملے گی لیکن جہاں یہودیوں کی اکثریت ہے وہاں ہر چیز فراوانی سے دستیاب ہے۔

## غزہ پٹی کا علاقہ

غزہ پٹی کا علاقہ اسرائیل نے 1967 کی جنگ میں چھینا تھا اور پھر اس کو اپنی کالونی بنا لیا۔1970 کی دہائی میں یہاں مکانات بننا شروع ہوئے اور ہزاروں یہودی آباد ہو

گئے۔ 2000 تک اسرائیل نے پوری طرح من مانی کی اور مسلمانوں کو ہر طرح سے پریشان کیا لیکن دوسری انتفاضہ تحریک کے شروع ہوتے ہی اسرائیلیوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اب فلسطینی قوم کو مزید دبایا نہیں جا سکتا۔ فلسطین کے نوجوانوں، معصوم بچوں اور خواتین نے بغیر ہتھیاروں کے صہیونی غاصبوں کے خلاف جنگ لڑی اور اپنے خون کی دھار سے خنجروں کو مات دی۔ دوسری انتفاضہ تحریک تقریباً پانچ سال تک چلی اور آخر میں صہیونی درندوں کو یہ احساس ہوا کہ ان کے لئے بہتری اسی میں ہے کہ غزہ سے دستبردار ہو جائیں۔ 5 200 میں آخر کار یہودیوں کو غزہ پٹی فلسطینیوں کے حوالے کرنا پڑی۔ غزہ اسٹرپ بحر روم کے کنارے پھیلا ہوا ایسا علاقہ ہے جس کی سرحدیں شمال مشرق میں اسرائیل اور مغرب جنوب میں مصر سے ملتی ہیں۔ اسرائیل سے ملنے والی سرحد 41 کلومیٹر لمبی ہے جب کہ مصر سے ملنے والی سرحد 12 کلومیٹر طویل ہے۔ غزہ پٹی کا کل رقبہ 360 اسکوائر کلومیٹر ہے اور یہاں کی کل آبادی 15 لاکھ ہے۔ اس کی آبی اور ہوائی سرحدوں پر ابھی بھی اسرائیل کا غاصبانہ قبضہ ہے۔ اسی لئے اس کا جب دل چاہتا ہے وہ یہاں کے مظلوم عوام تک پہنچنے والی رسد بند کر دیتا ہے اور یہاں کے لوگ دانے دانے کو ترستے ہیں۔

جس جگہ ہم لوگ لائے گئے تھے اس کو صدیروت ٹاؤن کہا جاتا ہے۔ (ہم لوگوں کو پہلے ہی یہ بتا دیا گیا تھا کہ غزہ میں داخلہ ممکن نہیں ہے وہاں رملہ جیسے حالات نہیں ہیں) یہ اسرائیلی قصبہ غزہ سٹی کے شمال مشرق میں ایک فلسطینی قصبہ بیت حنون کے پاس واقع ہے۔ 2000 تک صدیروت کو ایک محفوظ علاقہ سمجھا جاتا تھا لیکن انتفاضہ کی شروعات کے بعد یہ علاقہ فلسطینی جدوجہد کی زد میں آ گیا اور 30 برس تک سکون سے زندگی گزارنے والے یہودیوں کی زندگی میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ فلسطینیوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے والوں





کی زندگی بھی تنگ ہونے لگی۔

یہاں کے مقامی باشندوں کا کہنا ہے کہ یہاں پچھلے پانچ برسوں میں حماس کی جانب سے پانچ ہزار قسام میزائل گرائے جا چکے ہیں۔ یعنی ہر سال ایک ہزار میزائل یہاں گرتے ہیں جسکا مطلب یہ ہوا کہ اوسطاً تین میزائل روزانہ یہاں گرتے ہیں۔ اسرائیلی ان میزائلوں سے پیدا شدہ خوف کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یہ میزائل بلا سبب پھینکے جاتے ہیں یا اسرائیلی فوجوں کی کاروائی کے خلاف حماس کی یہ جوابی کارروائی ہوتی ہے؟ میزائلوں کا ذکر ذرا دیر بعد۔۔۔۔ ابھی تو صدیروت کی ایک بہت اہم اور حق پسند یہودی شخصیت سے آپ کو متعارف کرائیں، جس سے مل کر یہ لگا کہ اہل باطل میں بھی حق پسند ضرور ہوتے ہیں۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ صدیروت میں واقع Sapir College کے ایک پروفیسر جناب ظوہر اویتان (Zohar Avitan) سے ملنے کا موقع ملا۔ انھوں نے فلسطینیوں پر ڈھائے جا رہے تمام مظالم کے لئے اسرائیل اور امریکہ کی پالیسیوں کو ذمہ دار قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ امن کے سلسلے میں اسرائیل کی حکومت سنجیدہ نہیں ہے۔ وہ تو امن کو صرف اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنائے ہوئے ہے۔ اسرائیلی حکومت مسئلہ کو حل کرنا ہی نہیں چاہتی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے علاقے کی ساری آبادی زیر زمین پناہ گاہوں میں چھپنے پر مجبور ہے اور ہمارے بچوں کی زندگی اتنی دشوار ہے کہ وہ گھر سے باہر کھیلنے بھی نہیں جا سکتے۔ اسکول جاتے ہیں تو یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ گھر واپس آئیں گے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہی حال سرحد کے اس پار فلسطینیوں کے علاقے میں بھی ہے۔ پروفیسر ظوہر نے انتہائی جسارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم

میزائلوں کا نہیں اپنے لیڈروں کی پالیسی کا شکار ہیں۔ ہمارے سیاستداں حماس اور الفتح کوآپس میں لڑوا کر امن قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں جو سراسر ایک حماقت ہے۔

پروفیسر ظوہر نے ہندوستانی وفد کو لنچ کروایا اور سلائڈ شو کی مدد سے مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ یہاں بھی ہم تینوں صحافیوں کو کمپیوٹر مل گئے اور انٹرنٹ کے ذریعہ اپنے Dispatch روانہ کرنے کا موقع مل گیا۔ ہم لوگ رپورٹ بھیجنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ عرصہ تک مصروف رہے۔ اس درمیان وفد کی وہاں کیا مصروفیت رہی ہم کو معلوم نہ ہو سکا۔ جب ہم لوگ اپنے Dispatch بھیج چکے تو پروفیسر ظوہر نے ہم لوگوں سے کہا کہ چلئے آپ کو صدیروت کی سیر کروائیں۔ وفد کے ممبروں ساتھ کے ساتھ ہم تینوں صحافی بھی گھومنے کے لئے چل پڑے۔ یہ پورا شہر زیرزمین پناہ گاہوں کا ہے۔ غزہ کی طرف سے آنے والے قسام میزائلوں سے اسرائیلی شہریوں کو بچانے کے لئے وہاں کی حکومت نے سب ہی محلوں میں زیرزمین شیلٹر بنادئے ہیں۔ سائرن بجتے ہیں سارے شہر کے لوگوں کو اپنے اپنے محلہ کے شیلٹر میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ دن میں دوتین بار ایسا ضرور ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی کچھ اسرائیلی شہری ہلاک اور زخمی ہو جاتے ہیں۔ سرحد کے اس طرف مسلمان رہتے ہیں ان کو ہوائی حملوں سے بچانے کے لئے کوئی شیلٹر موجود نہیں ہے اور وہ صرف اللہ کی رحمت کے سائے اور شہادت کی چھاؤں میں زندہ رہتے ہیں۔

شہر کے مختلف بازاروں میں گھمانے کے بعد ہم لوگوں کو پروفیسر ظوہر ایک اونچے ٹیلے پر لے گئے۔ اس ٹیلے پر سے غزہ کا بیت حنون قصبہ بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ پروفیسر ظوہر نے کہا کہ اسی علاقہ سے صدیروت پر میزائل داغے جاتے ہیں۔ غزہ سے ہم لوگ صرف آٹھ سو میٹر کی دوری پر تھے۔ سرحد کے اس پار ہمارے وہ مسلمان بھائی تھے جو اسرائیل کی چیرہ





دستیوں کا مقابلہ صرف اللہ کی امداد کے سہارے کر رہے ہیں اور سرحد کے اس پار وہ ڈیلی گیشن کھڑا تھا جو ان لوگوں سے ہاتھ ملا رہا تھا جو پچھلے 60 سال سے خون کی ندیاں بہا رہے ہیں۔ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور پروفیسر ظوہر نے کہا۔۔ بھاگو۔۔۔ بھاگو۔۔۔ قسام۔۔۔۔ بھاگو۔۔۔ وفد میں شامل لوگوں کی حالت دیکھنے والی تھی کوئی مٹی میں پھسلتا ہوا بھاگا، کوئی جھاڑیوں میں الجھتا ہوا ٹیلے کے نچلے حصہ میں جا پہنچا۔ اسی کے ساتھ پورے علاقے میں سائرن بجنے لگے۔ لوگ گھروں اور دوکانوں سے نکل کر زمین دوز پناہ گاہوں میں چھپنے لگے۔ چند سیکنڈ کے بعد ایک اور دھماکہ ہوا۔ کچھ دیر تک سائرن چنگھاڑتے رہے ،لوگ پناہ گاہوں کی جانب بھاگتے رہے۔ ہم لوگ بھی ٹیلے کی آڑ میں دبکے ہوئے بیٹھے رہے۔ ذرا دیر میں سائرن خاموش ہو گئے اور ہم لوگ نیچے کی طرف اترے۔

جب ہم سب بس میں بیٹھ گئے تو میں نے ڈیلی گیشن کے لوگوں کو چھیڑتے ہوئے کہا کہ اگر اس ڈیلی گیشن کے سب لوگ قسام کے حملے میں مرجاتے تو ہندوستان میں سب یہی کہتے۔۔۔ دیکھا! گئے تھے یہودیوں سے ہاتھ ملانے تو اللہ نے یہودیوں کی موت بھی دی۔۔۔ لیکن کسی ایک کو بھی میرا یہ مذاق اچھا نہیں لگا۔ اس حملہ کے بعد ہمارے گائڈ سالومن نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جیسے یہ حملہ ہندوستانی وفد پر کیا گیا تھا۔ وفد والے بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ شائد حماس کے کارکنوں نے ٹیلے پر چڑھے ہوئے لوگوں کو دیکھ لیا اور چوں کہ سب لوگ قصبہ کی طرف اشارہ کر رہے تھے، اس لئے خطرہ سمجھ کر میزائل داغ دیا۔ اس میزائل کے حملے میں کوئی اسرائیلی ہلاک ہوا یا نہیں اس بارے میں کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ وفد کے اراکین یہی سمجھ رہے تھے کہ میزائل سے ان ہی پر حملہ ہوا تھا، حالانکہ حماس کا نشانہ اتنا کچا نہیں تھا کہ جہاں وفد کھڑا تھا میزائل وہاں سے تین کلومیٹر دور گرتا۔ اگر حماس کو

حملہ کرنا ہی ہوتا تو اس کے جانباز دستے AK- 47 سے بھی حملہ کر سکتے تھے کیوں کہ اس رائفل کی رینج میں ہم لوگ بہت آسانی سے آسکتے تھے۔ چوں کہ وفد کے ساتھ کوئی اسرائیلی فوجی نہیں تھا اور سب ہی لوگ شہری لباس میں تھے، اس لئے حماس نے کوئی حملہ نہیں کیا۔ بہر حال کسی طرح سے صدیروت سے یروشلم کی واپسی کا سفر شروع ہوا۔ راستے میں حدشہ نام کے ایک محلہ میں گائڈ سالومن نے ہم کو ایک بہت خوبصورت اسپتال دکھایا اور کہا کہ یہ دنیا کے بہترین اسپتالوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں عرب ممالک کے کئی فرمانروا خفیہ طریقہ سے آکر علاج کروا چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ محض ایک پروپیگنڈہ ہو یا واقعی مسلم ممالک کے کچھ آمر یہاں علاج کے لئے آئے بھی ہوں۔

یروشلم پہنچنے پر ہمارے گائڈ سالومن نے ڈیلی گیشن کے سب ممبروں کو واپس ہوٹل بھیج دیا لیکن ہم تینوں صحافیوں کو وہ Holocaust Museum دکھانے پر بضد تھا۔ میں اس میوزیم کو دیکھنے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں رکھتا تھا کیوں کہ مجھے معلوم تھا کی یہودی اس میوزیم کے ذریعہ خود کو آج بھی مظلوم ثابت کرنے کا ناٹک کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے مقابلے میں تو ہٹلر کے ظلم وستم کچھ بھی نہیں تھے۔ میری طرف سے انکار کئے جانے پر شیخ منظور صاحب نے کہا کہ یہ لوگ اس میوزیم کے تعلق سے بہت زیادہ جذباتی ہیں اس لئے چلئے دیکھ ہی لیتے ہیں۔ شائد یہ میوزیم دکھانے کے لئے ہمارے گائڈ پر اسرائیلی حکام کا بہت دباؤ تھا اسی لئے غزہ سے ہم کو سیدھے Yad Vashem یعنی ہولوکاسٹ میوزیم میں لے آیا تھا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو میوزیم بند ہو چکا تھا۔ ہمارے اسرائیلی گائڈ نے بہت کوشش کی کہ ہم اندر چلے جائیں لیکن یہ کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ بہر حال کسی طرح وہ ہم کو ایک ایسے حصہ میں لے گیا جو ہولوکاسٹ میں مبینہ طور پر ہلاک ہونے





والے اطفال کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ میوزیم کا یہ حصہ بالکل تاریک تھا۔ اس میں صرف چھ شمعیں روشن تھیں لیکن میوزیم کی دیواروں پر لگے بے شمار شیشوں میں ان کا عکس کئی ہزار شمعوں کی شکل میں نظر آرہا تھا۔ ہمارے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کیوں کہ تقریباً پینتالیس برس پہلے فلم مغل اعظم میں کے آصف نے شیش محل کے سیٹ میں بھی اسی طرح کی فنکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ باہر نکل کر اسرائیلی ہرکارے نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو بچوں کی یاد میں بنایا گیا میوزیم کیسا لگا؟ تو میں نے کہا یہ میوزیم دیکھ کر مجھے وہ بچے یاد آئے جن کو اسرائیل کی فوج نے غزہ وحیفہ میں شہید کیا ہے۔ میرے اس جواب پر اس اسرائیلی کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ پھر تھوڑا سا آگے بڑھے تو اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ سامنے ہمارا قبرستان ہے جہاں ہر روز ایک دو اسرائیلی سپاہیوں کی لاشیں فلسطینی علاقوں سے لائی جاتی ہیں۔ میں نے کہا کہ اس میں کیا خاص بات ہے؟ فلسطین میں تو ہر قبرستان میں ہر دن آپ حضرات کی مہربانی سے پانچ چھ لاشیں دفن کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد میں نے یہ بھی کہہ ہی دیا کہ اگر فلسطین کی حکومت اسرائیلی مظالم کا ایک ایسا ہی میوزیم بنائے تو اس میں جرمنی کے مبینہ ہولوکاسٹ سے زیادہ بھیانک تصاویر ہوں گی۔ ہمارے اسرائیلی گائڈ کا چہرہ اتر چکا تھا مگر میرے صحافی دوست بہت خوش تھے کہ میں نے مصلحت پرستی سے کام نہ لیتے ہوئے حق بیانی سے کام لیا۔

وہاں سے لوٹ کر ایک بار پھر ربّائی ڈیوڈ روزن سے ہم لوگوں کی ملاقات ہونا تھی۔ وہ وفد کے لوگوں کے تاثرات جاننا چاہتے تھے۔ وفد میں شامل لوگوں نے اس وفد کو کافی کامیاب بتایا۔ ایک صاحب تو اتنی لمبی ہانکنے لگے کہ بولے کہ یہاں سے امن کا جو پیغام ہم نے شروع کیا ہے اس کو دنیا بھر میں پھیلائیں گے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اسرائیل کی جو

تصویر ان کے ذہنوں میں تھی وہ بدل گئی اور یہاں ویسا نہیں ہے جیسا کہ ہم سمجھتے تھے۔

میں نے کہا کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تو فلسطینیوں کو مظالم میں ہی گھرا پایا اور اگر بچپن سے آج تک کسی ملک سے بے انتہا نفرت کی ہے تو وہ اسرائیل ہی ہے۔ یہاں آیا تو یہاں بھی فلسطینیوں کے مصائب میں اضافہ ہی پایا۔ میں نے کہا کہ امریکن جوئش کمیٹی امن کی لاکھ کوششیں کرے لیکن جب تک کہ بیت المقدس کا معاملہ حل نہیں ہوجاتا کسی طرح امن نہیں ہوسکتا۔ میں نے ان سے کہا کہ امن کی کوششیں اگر کی جاتی ہیں تو وہ فلسطینیوں کے بیچ میں ہونی چاہئیں۔ جن لوگوں کی اپنے ہی ملک میں کوئی پہچان نہیں ہے وہ یہاں کیا رول ادا کرسکیں گے؟

اس کے بعد کئی لوگوں نے سچائی بھی بیان کی اور اسرائیل کے مظالم پر افسوس کا اظہار بھی کیا۔ پی ٹی آئی کے صحافی ذیشان حیدر نے کہا کہ مارٹن لوتھر کنگ نے کہا تھا کہ اگر ایک جگہ بھی ناانصافی ہورہی ہو تو یہ ہر جگہ انصاف کے لئے خطرہ ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ آپ کا ہولوکاسٹ میوزیم دیکھ کر مجھ کو چار مہینہ کا (امام ہیجو نام کا) وہ بچہ یاد آیا جس کے منہ پر دوسری انتفاضہ کے دوران 2004 میں اسرائیلی فوج کا پھینکا ہوا گولا لگا تھا۔ ذیشان نے کہا کہ فلسطین میں جتنے بچوں کی قبریں ہیں اتنی دنیا میں کسی ایک جگہ نہیں ہوں گی۔ بعد میں اٹھ کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا (کیوں کہ نماز کا وقت نکلا جارہا تھا) اس لئے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وفد کے باقی لوگوں نے کیا کہا۔ جب لوٹ کر آیا تو میزبان ڈیوڈ روزن کی جانب سے وفد کے لوگوں کا شکریہ ادا کیا جارہا تھا اور امن کی اس کوشش کو آگے بڑھانے کی بات کی جارہی تھی۔ پریہ ٹنڈن نے کہا کہ اس کے بعد امریکہ اور آسٹریلیا میں ایسے ہی وفد جائیں گے اور وہاں رہنے والے یہودیوں سے ان کی ملاقات کروائی جائے گی۔





رات کو اسرائیل کی وزارت خارجہ کی طرف سے ایک ڈنر دیا گیا جس میں وزارت خارجہ کی اہم افسر Ms. Ruth Kahanoff اور دیگر لوگ مہمان تھے۔ اس ڈنر میں اسرائیل کی وزارت خارجہ کے لوگ بس یہی بات کرتے رہے کہ ہندوستانی وفد کا یہ دورہ مشرق وسطیٰ میں امن کے نئے دروازے کھولے گا۔ میں یہی سوچتا رہا کہ یہاں سے جاکر تو وفد میں شامل لوگ اپنے گھر کا دروازہ کھولتے ہوئے بھی گھبرائیں گے تو بھلا مشرق وسطیٰ میں یہ لوگ کیا کریں گے۔ ایک ایسا وفد جس میں کوئی مولانا اردو کے علاوہ کوئی زبان نہ جانتا ہو وہ مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کی کیا مدد کرے گا؟ اس ڈنر میں اسرائیلی وزارت خارجہ کے ایک افسر منصور سے بھی ملاقات ہوئی جن کا تعلق دروزی فرقہ سے تھا۔ جتنی دیر تک وفد کے لوگ اور اسرائیلی افسر ایک دوسرے کی تعریف وتوصیف کرتے رہے، میں وفد کی باتوں کو چھوڑ کر منصور سے دروزی فرقہ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔

ڈنر کے بعد ہم لوگ جب بس میں سوار ہوئے تو اسرائیلی وزارت خارجہ کا ایک افسر بھی ہمارے ساتھ ہوٹل تک آیا۔ اس نے راستے میں ہم لوگوں کو بتایا کہ صدیروت میں ہندوستانی وفد پر میزائل کا جو حملہ حماس نے کیا تھا اس کا بدلہ اسرائیل نے لے لیا اور غزہ میں جوابی حملہ کرکے چھ لوگوں کو ماردیا۔ اس خبر سے بے انتہا تکلیف ہوئی۔ مجھ کو لگا کہ ہمارے 6 فلسطینی بھائی محض ہم لوگوں کی وجہ سے مارے گئے۔ میں سوچنے لگا کہ ہم لوگ سرحد پر کیوں گئے؟ رات گیارہ بجے کے بعد ہم لوگ ہوٹل واپس پہنچے۔

آج ہوٹل یروشلم ریجنسی میں ہم لوگوں کی آخری رات تھی۔ ہم لوگوں نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ فجر کی نماز انشاءاللہ مسجد اقصیٰ میں پڑھ کر نکلیں گے۔ میں لاکھ کوشش کے بعد بھی سو نہیں پارہا تھا بار بار مجھے لگتا تھا کہ کوئی میرے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا ہے ہر بار

میں باہر نکل کر دیکھتا مگر کوئی نظر نہیں آتا۔ پھر محسوس ہوتا کہ کوئی کمرے کے باہر کی بالکنی میں سے میرے کمرے میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس پریشانی کی وجہ سے رات جاگ کر ہی گزری۔

صبح ساڑھے چار بجے ہم لوگ مسجد اقصیٰ کے لئے روانہ ہوئے۔ گو کہ ابھی اندھیرا تھا پھر بھی پرانے شہر کے لوگ بیدار ہو چکے تھے اور کچھ بزرگ حضرات و نوجوان مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ تھے۔ پانچ بجے اذان ہوئی تھوڑی دیر بعد نماز جماعت سے ادا کی گئی۔ امام صاحب نے نماز میں دعائے قنوت پڑھائی اور اس میں مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے والوں کی مذمت کی اور اللہ تعالیٰ سے رحم و کرم کی بھیک مانگی۔ نماز کے بعد پیش امام سے ملاقات ہوئی۔ کچھ دیر تک ان سے بات کی انھوں نے بھی بتایا کہ یہاں تین امام مقرر ہیں جو الگ الگ وقت کی نمازیں پڑھاتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے مسجد اقصیٰ کو آخری سلام کیا اور چلتے وقت میں نے اللہ سے صرف ایک ہی دعا کی کہ اے اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے مسلمانوں کو سرخرو کر اور مسجد اقصیٰ پھر سے فرزندان توحید کے قبضہ میں آئے اور اگلی بار جب میں یہاں آؤں تو مسلمانوں کی حکومت ہو (آمین)۔ مسجد اقصیٰ پر ایک حسرت بھری نظر ڈال کر میں باہر نکلا۔ ہماری بس کافی دور کھڑی تھی اس لئے قریب ایک کلومیٹر پیدل چل کر بس پر سوار ہونا پڑا۔ یہاں سے بس ہوائی اڈہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ چالیس منٹ بعد ہم ہوائی اڈے پہنچے۔ یہاں اسرائیلوں کی بہت بھیڑ تھی چھٹیاں گزارنے والے یہودی واپس جا رہے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اسرائیل میں بسنے والے زیادہ تر یہودی دوہری شہریت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ کام امریکہ اور برطانیہ میں کرتے ہیں۔ سال بھر رہتے بھی وہیں ہیں۔ ان کے گھروں میں تالا پڑا رہتا ہے





لیکن ان کی شہریت کا خانہ ہمیشہ بھرا رہتا ہے۔ زیادہ تر اسرائیلی یہاں چھٹیاں گزارنے کے لئے آتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے اسکولوں میں پڑھنے والے بہت سے بچے بھی یہاں گروپ کی شکل میں آتے ہیں۔ جب یہ یہودی بچے بن غریان ایئرپورٹ پر ہوائی جہاز سے اترتے ہیں تو اسرائیل کا قومی ترانہ Hatikva گاتے ہوئے اترتے ہیں۔ جس دن ہم لوگ پہنچے تھے اس دن بھی کچھ امریکی اسکولوں کے اسرائیلی بچے ایک گروہ کی شکل میں قومی ترانہ گاتے آرہے تھے اور آج بھی ایسی ہی ٹولیاں واپس جا رہی تھیں۔ دنیا میں اسرائیل ہی ایک ایسا واحد ملک ہے جس کے ائیرپورٹ پر یہودیوں کے علاوہ دوسری قوم کے لوگ شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں ورنہ جس ایئرپورٹ پر بھی دیکھئے ہر قوم اور ملت کے لوگ مل جاتے ہیں۔ اسرائیل کے باشندوں کو ائیرپورٹ پر ایک اور سہولت حاصل ہے۔ یہ لوگ جب وطن واپس آتے ہیں تو ایئرپورٹ پر لگی ایک خاص مشین میں اپنا شناختی کارڈ ڈالتے ہیں اس کے بعد مشین میں لگے ایک خاص اسکرین پر یہ لوگ اپنے ہاتھ کا پنجہ رکھتے ہیں۔ ان کی انگلیوں کے نشان پڑھنے کے بعد مشین ان کی اسرائیل میں واپسی کی تاریخ درج کر دیتی ہے۔ یہاں سے واپس جاتے وقت بھی یہی عمل دوہرایا جاتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں کو امیگریشن سے نجات مل جاتی ہے۔ دوہری شہریت رکھنے کے سبب یہ لوگ پیسہ تو کماتے ہیں یورپ اور امریکہ میں لیکن خدمت کرتے ہیں اسرائیل کی۔ اس طرح کے باشندوں کی مدد سے اسرائیل کی حکومت کو یہودی آبادی کے سلسلے میں جھوٹے اعداد و شمار فراہم کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

# وطن واپسی

واپسی کے وقت ہوائی اڈے پر ہم لوگوں کو اس وقت تک پریشانی نہیں ہوئی جب تک گائڈ سالومن ہمارے ساتھ تھا۔ سامان وغیرہ بک کرنے میں کسی پریشانی کا سامنا کرنا نہیں پڑا لیکن امیگریشن کے کاؤنٹر پر جانے کے بعد مجھ سمیت تین لوگوں کے پاسپورٹ کو بہت دیر تک تحویل میں رکھا گیا اور کافی دیر بعد مجھ سے پوچھا گیا کہ آپ کے دادا کا نام کیا تھا؟ میں نے کہا اولاد حسین شاعرؔ۔ کچھ دیر بعد میرا پاسپورٹ واپس مل گیا مزید سوالات نہیں کئے گئے۔ دوسروں سے بھی ایسے ہی بے سر پیر کے سوالات کئے گئے اور بعد میں پاسپورٹ واپس کر دئے گئے۔ امیگریشن سے نجات پا کر ہم لوگ لاؤنج میں پہنچے تو وہاں اخبارات دیکھنے کو ملے۔ ان اخبارات میں کل کے قسام میزائل کے حملے کے بارے میں کچھ الگ ہی تصویر تھی۔

یروشلم پوسٹ نے اس خبر کی حقیقت الگ ہی بیان کی تھی۔ یہ حملہ بھی اسرائیل کے استبداد کی ایک حقیقی کہانی سنا رہا تھا۔ اخبار کے مطابق اسرائیل کی فوج نے زمین سے زمین پر مار کرنے والی میزائل سے حملہ کر کے بریج رفیوجی کیمپ کے پاس ایک جیپ میں سفر کر رہے 6 نوجوانوں کو شہید کر دیا تھا جن پر اسرائیلی فوج کو شبہ تھا کہ یہ حماس کے جنگجو تھے۔ اسرائیل کا کہنا تھا کہ دو دن پہلے ان ہی لوگوں نے اسرائیلی نشانوں پر مارٹر توپ سے حملہ کیا تھا۔ اسرائیل اس طرح کے الزام لگا کر اکثر بیشتر فلسطینی نوجوانوں کو شہید کرتا رہتا ہے۔ ہندوستانی وفد کی صدیروت میں موجودگی کا فائدہ اٹھانے کے لئے اسرائیل نے وفد کے وہاں پہنچنے سے ایک گھنٹہ قبل ہی یہ حملہ کیا تھا۔ حماس نے اس حملے





کے جواب میں صدیروت پر دو قسام میزائل داغ کر صرف اپنا احتجاج درج کروایا تھا۔

ہندوستانی وفد پر حملہ کی خبر سے اسرائیل کو کچھ لمحوں کے لئے فائدہ حاصل بھی ہو گیا اور ہندوستان کے کچھ اخباروں میں یہ خبر چھپ گئی کہ حماس نے ہندوستانی ڈیلیگیشن کو نشانہ بنایا۔ اصل میں امن ڈیلی گیشن کی اہمیت بڑھانے کے لئے اسرائیل کی حکومت نے صدیروت پر حملہ کا ناٹک کیا تھا۔ ان حرکتوں سے اسرائیل کی حکومت دنیا پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ہم تو امن چاہتے ہیں لیکن کچھ لوگ امن کے مخالف ہیں۔ کئی اسرائیلی افسروں نے ہندوستان میں ہوئے احتجاج کو امن دشمنی سے جوڑنے کی کوشش کی اور کہا کہ کچھ لوگ امن کو ناپسند کرتے ہیں اس لئے وہ آپ کی آمد کی مخالفت کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو بدنام کرنے کا کوئی بھی موقع امریکہ اور اسرائیل ہاتھ سے کب جانے دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات تو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ ہندوستان کے چند غیر معروف لوگ بھلا مشرق وسطیٰ میں کیا رول نبھا سکتے ہیں؟ اگر اسرائیل کو امن کی اتنی ہی زیادہ خواہش ہے تو بھارت سے وفد بلانے کے بجائے اپنے پڑوس میں بیٹھے محمود عباس کو بلا کر امن قائم کر سکتا ہے۔ محمود عباس تو حماس کی طرح اسرائیل کے دشمن بھی نہیں ہیں بلکہ گہرے دوست بن چکے ہیں پھر یہ جھوٹ موٹ کے امن کا ناٹک کیوں؟ تاریخ گواہ ہے کہ اسرائیل کی حکومت نے اس طرح کے تمام وفود کا استعمال اپنے فوائد کے لئے کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں ہندوستان سے کچھ دوسرے وفود اسرائیل جائیں اور جھوٹ موٹ کے امن مذاکرات کا ایک حصہ بنیں۔

اسرائیل کے اخباروں میں کچھ ایسی خبریں بھی چھپی تھیں جو اسرائیل کے لئے تو بری خبر کا درجہ رکھتی تھیں لیکن مسلمانوں کے لئے خوش آئند علامت تھیں۔ ایک اخبار نے اپنی

اشاعت میں مغربی کنارے کی صورتحال کو تشویشناک بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ وہاں حماس نے اپنے قدم جما لئے ہیں اور روز بروز اس کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ اخباروں نے اس طرح کی خبر بھی دی تھی کہ حماس کی مسلح ٹکڑیاں بھی مغربی کنارے میں اپنے مستقر بنانے میں لگی ہیں۔ اسرائیلی کالم نگاروں کا کہنا تھا کہ حماس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے سبب الفتح کے لوگ اس کے ساتھ مصالحت کی بات کر رہے ہیں۔ (یعنی دو بھائیوں میں اگر مصالحت ہو تو یہ اسرائیل کے لئے تشویش کی بات ہے۔) کئی اسرائیلی اخباروں نے یہ خبر بھی چھاپی کہ شام میں محمود عباس کے ایک قریبی ساتھی جبرئیل رجب نے حماس کے رہنما خالد مشعل سے خفیہ طور پر ملاقات کی ہے اور مصالحت کا راستہ ڈھونڈا ہے۔ دراصل اسرائیل کی حکومت کبھی نہیں چاہتی کہ حماس اور الفتح ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس لئے اس نے حماس کے خلاف ایک نئے قسم کا پروپگینڈہ شروع کر دیا ہے۔ اسرائیل کے ایجنٹ اب فلسطینیوں کو حماس سے منحرف کرنے کے لئے یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ حماس شیعوں کی مدد سے الفتح کے خلاف محاذ کھول رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ حماس بھی سنی مسلمانوں کی تنظیم ہے اور الفتح بھی، اس لئے ان دونوں کو الگ کرنے کے لئے اسرائیلی ایجنٹ بس یہی کر سکتے ہیں کہ ایک ٹکڑے پر شیعہ نوازی کا الزام لگائیں۔ حماس کے حامی ایک فلسطینی لیڈر نے اس لزام کے جواب میں ایک بار میڈیا کے لوگوں سے کہا تھا کہ اسرائیل اور امریکہ سے مدد لینے کے بجائے شیعوں سے مدد لینا مناسب ہے کیوں کہ وہ بھی مسلمان ہیں اور مسلمان سے مدد لینے میں کوئی ہرج نہیں۔

اس سفرنامہ میں کچھ اہم اطلاعات میں تحریر نہیں کر سکا کیوں کہ وہ موضوع سے باہر تھیں لیکن ان کو چھوڑنا بھی مناسب نہیں ہے اس لئے آخر ان کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ مجھے





یقین ہے یہ معلومات بھی قارئین کی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔

اسرائیل میں رہنے والے مسلمانوں میں زیادہ تر لوگ مزدور پیشہ ہیں۔ جہاں جہاں مکانوں کی تعمیر کا سلسلہ چل رہا ہو وہاں آپ کو فلسطینی نوجوان اپنا گاڑھے خون کو پسینے کی شکل میں بہاتے ہوئے مل جائیں گے۔

مسلمانوں کی زندگی چھوٹے چھوٹے کاروبار تک محدود رہ گئی ہے۔ امیر طبقہ صرف یہودیوں میں ہے۔ مسلمان یا تو غریب ہیں یا درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسجد اقصیٰ میں جائیے تو بہت سی مسلم خواتین آپ کو صدا دیتی ہوئی مل جائیں گی۔ یہ پریشان حال عورتیں۔۔۔یا شیخ۔۔۔صدقہ۔۔۔صدقہ۔۔۔کہہ کر آپ کو مخاطب کرتی ہیں۔ کچھ معذور افراد بھی یہاں خیرات کی طلب میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔

مسلمانوں کے علاقوں میں ٹورسٹ آنا بند ہو گئے ہیں کیوں کہ مسجد اقصیٰ میں دوسری قوموں کا داخلہ ممنوع ہے اور اسرائیلی سرکار مسلمان سیاحوں کو دنیا کے کسی گوشے سے یہاں آنے نہیں دیتی اس لئے یہاں کو لوگ ٹورسٹ نام کی کسی شئے سے واقف ہی نہیں ہیں۔ ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ کچھ برس قبل تک ایک مسلم ٹور آپریٹر انڈیا سے کچھ زائرین کو لے کر اردن کے راستے یہاں ایک دو دن کے لئے آتا تھا مگر اب وہ سلسلہ بھی بند ہے۔ سیاحوں کے نہ آنے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کے تقریباً تمام ہوٹل بند ہو چکے ہیں یا بند ہونے والے ہیں۔ مسلم علاقوں میں صرف ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا وہ بھی اب بند ہو چکا ہے۔

یروشلم کے پرانے شہر کے بازاروں میں شام ہوتے ہی دکانیں بند ہونے لگتی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ مسجد اقصیٰ کے ارد گرد کی دکانیں عصر کی نماز کے فوراً بعد بند ہونے لگیں

اس پر میں نے ایک نوجوان سے پوچھا کہ دکانیں اتنی جلدی کیوں بند ہورہی ہیں تو اس مسلم نوجوان نے کہا کہ یہاں شام کے وقت نکلنے والوں کو اسرائیلی پولس تنگ کرتی ہے، اس لئے عام شہری گھروں میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ جب عام لوگ گھر سے نہیں نکلتے تو دکاندار سامان کس کے ہاتھ بیچیں گے؟ اس لئے مغرب سے پہلے ہی سارا بازار بند ہو جاتا ہے۔ ایک دکاندار محمد حنیف نے اسرائیلی فوجیوں کی موجودگی میں جرأت مندی سے کہا کہ ان ہی لوگوں کی وجہ سے ہم برباد ہورہے ہیں۔ اللہ ان کے تسلط سے ہمیں آزاد کرائے۔

اس علاقہ میں عرب کی تہذیب کے ہزاروں سال پرانے نشان آج بھی واضح اور صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ پتلی پتلی گلیاں اور ان میں ڈھلان اور چڑھائیاں بہت متوازن ہیں۔ ان ہی گلیوں میں جگہ جگہ حقہ پیتے ہوئے لوگ بیٹھے مل جاتے ہیں۔ میں نے بھی ایک دکان کے باہر بیٹھے کچھ فلسطینی نوجوانوں کے ساتھ حقہ کا کش لگایا تو وہ لوگ بڑے خوش ہوئے۔

اس کے بعد کچھ ایسے دلچسپ واقعات کا ذکر بھی کرنا چاہتا ہوں جو قارئین کو یقیناً پسند آئیں گے۔

جب میں دہلی سے ممبئی کے لئے روانہ ہوا تو میرے برابر والی سیٹ پر جو مولانا صاحب تشریف فرما تھے انھوں نے مجھ سے بہت سادگی سے پوچھا کہ ہم لوگ کس لئے جا رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ اس پر انھوں نے کہا کہ مجھے تو صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ ہم کو مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کا موقع ملے گا۔

ممبئی پہنچنے پر وفد کے ایک اور ممبر سے میں نے پوچھا کہ کیا وہ جانتے ہیں کہ یہ وفد





اسرائیل کیوں جارہا ہے تو انھوں نے کہا کہ اسرائیل میں ایک امن کانفرنس ہے جس میں دنیا بھر سے وفود آرہے ہیں اور ہندوستان کے وفد کی نمائندگی ہم لوگ کررہے ہیں۔ جبکہ حقیقت تو یہ تھی کہ نہ تو اسرائیل میں کوئی کانفرنس تھی نہ ہی وہاں بین الاقوامی وفود آئے تھے۔ ہندوستان سے گئے چار رکنی وفد اور میڈیا کے تین لوگوں کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ غالباً وفد کو مدعو کرنے والوں نے سب کو دھوکہ میں رکھا تھا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ یہاں تحریر کرنا مناسب ہوگا۔ رملہ میں فلسطینیوں سے ملاقات کے بعد جب ہندوستانی وفد روانہ ہونے لگا تو ایک ممبر نے بہت ہی خوبصورت سی ایک چادر نکالی اور انڈین سفارت خانے کے نمائندے جناب ذکر الرحمان کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ چادر ہم مرحوم یاسر عرفات کے مزار پر چڑھانے کے لئے لائے تھے لیکن ان کی قبر پر ہم لوگ جا نہیں سکے اس لئے اب۔۔۔۔ ذکر الرحمان صاحب بات کاٹتے ہوئے بولے۔۔۔۔ ''میرے مزار پر چڑھا رہے ہیں؟''

بہرحال ہمارا سفر ختم ہوا اور ہم لوگ وطن کی طرف چل پڑے۔ اسرائیل کے وقت کے مطابق ہم لوگ 10 بجے صبح ہندوستان کے لئے روانہ ہوئے (اس وقت ہندوستان میں دن کے 12.30 بجے تھے) اور ساڑھے سات گھنٹے کے اکتا دینے والے سفر کے بعد ہندوستانی وقت کے مطابق رات 8 بجے ممبئی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر پہنچے۔ یہاں سے وفد کے اراکین اور میری راہیں الگ ہوگئیں۔ مجھ کو تھوڑی دیر بعد قطر ائیرویز سے دوبئی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ ممبئی میں کچھ گھنٹے اپنے بیٹے عمران کے ساتھ گزارنے کے بعد میں قطر ائیرویز سے دوبئی کے لئے روانہ ہوگیا۔

اسرائیل میں ایک ہفتہ کے قیام کے دوران مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی سعادت تو

مجھ کو ملی ہے لیکن اپنی صحافتی زندگی کے اہم ترین سفر سے گزرنے کا موقع بھی ملا۔ میری زندگی ٹیلی ویژن کی صحافت میں گزری ہے لیکن یہاں مجھے پہلی بار پرنٹ کے لئے رپورٹنگ کرنی تھی۔ اسی لئے میں نے اپنے ایک ایک تجربہ کو قلم بند کرنے کی پوری کوشش کی۔ میں نے وہاں سے جو رپورٹیں بھیجیں میرے مدیر اعلیٰ جناب عزیز برنی نے ان کو میری واپسی تک کے لئے موقوف رکھا۔ میری بے باک رپورٹنگ اور اسرائیل میں بیٹھ کر اسرائیل کی پالیسیوں پر تنقید کرنا شاید میرے لئے اسرائیل میں مصیبت کا باعث بن جاتا۔ اس لئے راشٹریہ سہارا کے نہایت تجربہ کار گروپ ایڈیٹر جناب برنی نے مجھ سے کہا کہ آپ لوٹ آئیں تب چھاپیں گے۔ میں جس دن دوبئی سے واپس آیا محترم عزیز برنی صاحب نے کہا کہ آپ لکھنا شروع کریں اور بے باک ہو کر لکھیں۔۔۔ سچ بات کہیں۔۔ جو دیکھا، جو محسوس کیا اور جو سنا وہ سب لکھیں۔ جب تک آپ کی قسطیں پوری نہ ہو جائیں لکھتے رہیں۔ ان کے یہ تیور دیکھ کر مجھے لگا کہ اگر وہ خود اسرائیل جاتے تو بات کچھ اور ہی ہوتی۔۔۔ اسرائیل کے ظلم و ستم ۔۔۔ فلسطینیوں کی مظلومی۔۔۔ اس خطہ کی تاریخ۔۔۔ وہاں کے مسائل۔۔۔ وہاں کی جغرافیائی صورت حال اور امن مشن کی حقیقت پر وہ خوب لکھتے اور ایسا لکھتے کہ ان کی تحریر دستاویز کی شکل میں رکھی جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے اسرائیل جانے سے کئی دن قبل ان کے پاس اسرائیل جا رہے امن ڈیلی گیشن میں شرکت کا دعوت نامہ آیا تو اس وقت وہ عالمی سہارا اردو ٹیلی ویژن کے کارکنوں کے ساتھ میٹنگ کر رہے تھے۔ میٹنگ کے دوران ہی انھوں نے سب سے پوچھا کہ کیا ان کا اسرائیل جانا ٹھیک رہے گا؟ تو میٹنگ میں موجود کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ کے لئے اسرائیل جانا مناسب نہیں ہے اور کچھ نے کہا کہ آپ کو جانا چاہیے کیوں کہ





آپ جب وہاں سے لوٹیں گے تو وہ حقائق لکھیں گے جو کوئی اور لکھنے کی جرأت نہیں کرے گا لیکن اچانک برنی صاحب نے مجھے اسرائیل بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

صحافت ایک ایسا پیشہ ہے کہ آپ کو دشمن کے گھر سے بھی خبر نکالنا پڑتی ہے اور دوست کی خبر گیری بھی کرنی پڑتی ہے۔ کوئی صحافی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں آر ایس ایس کے دفتر میں نہیں جاؤں گا کیوں کہ وہ اسلام دشمن تنظیم ہے بلکہ ہر صحافی کا فرض ہوگا کہ وہ مسلم دشمن تنظیموں کے دفتر میں جائے گا اور وہاں سے ایسی خبریں نکالے گا جن سے اسلام دشمنی کی بو آتی ہے اور ایسی ہی خبروں کا وہ اپنے انداز میں تجزیہ کرے گا۔ صحافی کے خیالات کا اندازہ اس کی تحریر سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے قلم سے نکلے ہوئے سچ کی بنیاد پر ہی اس کے خیالات اور نظریات کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

کسی اخبار کی معتبریت کا ثبوت اس میں چھپنے والی خبریں ہی ہوتی ہیں۔ قارئین اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ سہارا کے علاوہ بھی کیا کسی اخبار نے اتنی تفصیل سے آپ کو ہندوستانی امن وفد کے بارے میں بتایا؟ اگر سہارا کا نمائندہ اس وفد میں شامل نہ ہوتا تو کیا آپ تک یہ حقائق پہنچتے؟ مجھ کو خوشی ہے کہ اسرائیل کے سفر نامہ میں قارئین نے زبردست دلچسپی دکھائی۔ کئی علاقوں میں اخبار کی ساری کاپیاں صبح سویرے ہی فروخت ہو جاتی تھیں۔ ٹیلی فون، فیکس اور ای میل کے ذریعہ بھی سہارا کے قارئین نے اپنی رائے ادارے تک پہنچائی جس کے لئے ہم ان کے ممنون و متشکر ہیں۔ ایک بار پھر سہارا نے ثابت کر دیا ہے کہ حق بیانی، صداقت اور صاف گوئی میں اس کا کوئی مد مقابل ہے ہی نہیں۔ جب سفر نامہ چھپنا شروع ہوا تو امن ڈیلی گیشن کے کچھ ممبروں نے مجھ سے فون کر کے ناراضگی کا اظہار کیا اور شکایت کی کہ میں ذاتیات پر حملہ کر رہا ہوں۔ ان کی کردار

کشی کرر ہا ہوں۔اس کا فیصلہ تو ہمارے قارئین کریں گے کہ میں نے کسی کی ذات کو نشانہ بنایا ہے یا صرف حقائق بیان کئے ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ امن ڈیلی گیشن کے لوگ اسرائیل سے واپس آکر ایک پریس کانفرنس بلا کر فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کی سچائی بیان کریں گے اور اسرائیل کی حکومت کی مسلم دشمن پالیسیوں کی کڑی نکتہ چینی کریں گے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔تو کیا میں بھی خاموش رہتا؟ اسرائیل جانا جرم نہیں تھا ،وہاں سے لوٹ کر خاموش رہنا جرم ہے۔سفر نامہ کی اشاعت کے دوران میں نے ڈیلی گیشن کے ممبروں سے گزارش کی کہ وہ میری تحریر کے تعمیری پہلوؤں پر دھیان دیں اور ایک مسلمان کی طرح سوچیں اور میرے سفر نامہ میں بیان کئے گئے واقعات کو کھلاڑیوں کے جذبہ کے تحت لیں۔میں نے وہاں سے لوٹ کر صرف حقائق بیان کیے ہیں۔اگر میری باتوں میں ایک لفظ بھی جھوٹ ہے تو اسرائیلی سفارت خانے سے اس کی تردید کروا دیں یا خود ہی اس کی تردید میں کوئی بیان جاری کر دیں لیکن اس سلسلے میں نہ تو وفد کی جانب سے کوئی تردید آئی، نہ اسرائیلی سفارتخانے کی طرف سے کوئی بیان جاری ہوا۔ بلکہ وفد کے ایک ممبر نے تو نام نہ بتانے کی شرط پر مجھے مبارک باد دی کہ میں نے حق گوئی سے کام لیا۔

اب میرا سفر نامہ ایک کتاب کی شکل میں آپ کے ہاتھ میں ہے۔مجھے امید ہے کہ اسرائیل اور امریکہ کے پروپگینڈہ نے آپ کے ذہن میں جو شکوک پیدا کئے تھے وہ اب دور ہو گئے ہوں گے۔





# حرف آخر

جدھر کا رخ بھی کرتا ہے ہمارے عہد کا مرحب
صہیونی سازشی ٹولہ بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے
جہاں بھی خون بہتا ہے کسی مظلوم انساں کا
نہ جانے کیوں وہاں امریکیوں کا ہاتھ ہوتا ہے

پہرے بٹھا رہا ہے ہر اک سمت سامراج
پھر سے لب فرات یزیدی کھڑے ہیں آج
غزہ کی بستیوں میں ہے محصور ایک قوم
کچھ لوگ کاغذوں پہ ہیں مصروف احتجاج

اٹھا کے نکلا ہے فرعون موسوی پرچم
لہو کے دیپ جلائے گئے ہیں راہوں میں
ملال یہ ہے کہ سازش میں وہ بھی شامل ہے
چراغ امن و اماں جو لئے ہے ہاتھوں میں

ہمارے پھول سے بچے لہو میں ڈوبے ہیں
صہیونیوں کی فلسطینیوں پہ یورش ہے
صدا یہ دیتا ہے غزہ سے خوں شہیدوں کا
یہ ظلم و جور تو امریکیوں کی سازش ہے

مسلم نہ ایک ہو سکے جب دین کے لئے
کیا متحد وہ ہونگے فلسطین کے لئے
ہے بدترین پھوٹ عرب لیگ میں مگر
اجلاس ہوتے رہتے ہیں تسکین کے لئے

❑●❑

# قطعہ تاریخ اشاعت کتاب

''صیہونی دہشت گردی۔ چاپ شکیلؔ حسن شمسی''

۲۰۰۸ء

زمانہ دیکھ لے صیہونیت کا چہرہ کھلا
شکیلؔ کے قلم ناز کو دکھی خلوت
تبھی تو وقت نے سرخی لگائی ہے یہ کہیں
شکیل شمسی کی قلمی صحافتی جلوت
۲۰۰۸ء



صہیونی دہشت گردی

# نئ نسل کی بیداری

درحقیقت یہ دور اسلامی بیداری کا دور ہے اور اس اسلامی بیداری میں فلسطین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ فلسطین پر غاصبانہ تسلط کو تقریباً ۶۰ سال کا عرصہ گذر چکا ہے اور اس طویل مدت میں فلسطینی مظلومین طرح طرح کے مصائب اور آزمائشی مراحل سے گذر چکے ہیں۔ جس میں ابتدائی مرحلہ کی مظلومانہ ومایوسانہ جدوجہد، اجباری مسافرت وآوارہ وطنی، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے خانہ وکاشانہ کی نابودی، اپنے عزیزوں کا بے رحمانہ قتل عام، اس کے بعد عالمی اور بین الاقوامی تنظیموں کے سایہ میں پناہ گیری، لاحاصل سیاسی معاملہ بندیوں کی یلغار، غاصبوں کے ساتھ مسلسل خسارہ وشکست پر مبنی مذاکرات اور ان طاقتوں کو واسطہ قرار دینا شامل ہے جو اس سانحۂ عظیم کی تخلیق اور اس کے دوام میں بنیادی کردار ادا کرتی چلی آرہی ہیں۔ ان تاریخی تجربوں کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ شجاعت وشہامت سے مالا مال ملت اسلامیہ فلسطین کی نئی اور ابھرتی ہوئی نسل بیداری وآزادی خواہی کی بلندترین چوٹی پر پہنچ گئی۔

(ولی امر مسلمین آیۃ اللہ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی)



# اسرائیل کی بھاری شکست

میری جنگ نے متدین اور دین دوست افراد کے علاوہ دین سے دور افراد پر بھی مثبت اثرات چھوڑے ہیں، بے عمل، دین سے دور، بے دین، گانا گانے والے گلوکاروں پر بھی اس جنگ نے عجیب وغریب اثرات چھوڑے ہیں مسلمانوں کے تمام طبقات اور فرقوں کو اس جنگ نے متاثر کیا ہے اہلسنت کے بڑے بڑے علماء متاثر ہوئے ہیں، وہ ہمارے پاس مبارک بادی کے لئے آئے ہیں بلکہ وہابی علماء بھی ہمارے پاس آئے انھوں نے ملاقات میں کہا کہ اس جنگ میں تو ہمیں یقین ہوگیا کہ تم حق پر ہو کیونکہ اگر تم حق پر نہ ہوتے تو خداوند عالم تمہاری مدد نہ کرتا خدا آپ کے ساتھ ہے خداوند عالم باطل پرستوں کا ہرگز ساتھ نہیں دیتا بس آپ لوگ حق پر ہیں، مصر، تیونس، مغرب، افریقہ میں بہت سارے پڑھے لکھے گریجویٹ افراد نے جنگ سے متاثر ہوکر مذہب حقہ کو اختیار کرلیا ہے اور وہ پہلے سے زیادہ حمایت کررہے ہیں۔

عرب حکمرانوں کو شرمندگی ہوئی ہے ان کو ہماری طاقت کا اندازہ نہ تھا اور وہ اتنی بڑی غیبی امداد پر بھی یقین نہیں کررہے تھے جو حزب اللہ کے کمانڈر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوئی؛ وہ اسرائیل کی طاقت سے خوفزدہ تھے اور اسی خوف سے اپنے بچاؤ کی خاطر جنگ کے شروع میں اسرائیل کی حمایت میں بیان دے دیا اور ہمارے اقدام کی مذمت کی لیکن جنگ کے نتائج نے انھیں شرمندہ کیا اور اب وہ اپنے بیانات پر پشیمان ہیں اور عرب عوام کے حوصلے بڑھے ہیں اسرائیلیوں کے حوصلے بہت ہی پست ہیں اور وہ نفسیاتی مریض ہوچکے ہیں۔

(حجۃ الاسلام سید حسن نصر اللہ سربراہ حزب اللہ، لبنان)